

نئی دہلی

تین غنڈے

افسانے

کرشن چیمز



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

یقین غنڈے

کرشن چندر

تین غمڈے

نیا ادارہ

جملہ حقوق محفوظ

بار سوم ۱۹۶۴

براہتمام: نعیم احمد چودھری

حزبیت اسلام پریس میخانہ

ترتیب

پال ، ۹

غالیچ ، ۲۹

ایک اکسٹرالزکی ، ۵۷

پھانسی کے سائے ، ۸۱

بحوث ، ۹۹

تین غنڈے ، ۱۱۷

پال

چپا آں !

”میں ڈارنگ !“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں تمہاری ڈارنگ نہیں ہوں۔“

”تم ہو۔ میں نے جب کہہ دیا۔ بس کیا تمہیں یقین نہیں آتا۔“

”میں یہ پہلے بھی سُن چکی ہوں۔“

”میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کئی بار۔ پھر اس میں۔“

”بڑے سٹور ہو تم۔“

”نہیں۔ میں سٹور نہیں ہوں۔ میں آریں ہوں۔ تم بھی آریں ہو۔ ہم

دونوں آئین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں فرانسیسی ہوں تم انگریز ہو۔ یہ
ہندوستان ہے، اور ہم دونوں آئین نسل کے افراد اس جنگل میں، اس صحرا
میں، اس ویرانے میں، اس سمندر میں لکیلے ہیں۔ ایک جزیرے کی طرح۔
بتاؤ ہم کیوں محبت نہ کریں ڈور تھی..... ڈور تھی تمہارا نام عجیب سا ہے
ڈور تھی، مجھے پسند نہیں ہے تمہارا نام ہونا چاہیے تھا۔ لی زل، از ایلا، روزا
وانا، ہاں میں وانا ٹھیک ہے۔ پیارا نام ہے، شرابی نام ہے۔ مغربی
فرانس کی بیلوں کی طرح لطافت ہے اس میں۔ وہ کیف، وہ بہار، وہ
رہنائی..... وانا.....!

”بڑی عجیب باتیں کرتے ہو تم، بڑی پیاری باتیں.....“
”تمہیں پسند ہیں نایہ باتیں۔ سبھی عورتیں مجھ سے ہی کہتی ہیں۔“
”سبھی عورتیں؟.....“ لڑکیا تم — ہٹو، مجھے جانے دو۔ میں
تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی۔“

”نہیں بیٹو، انگریزی قوم بھی سچ مچ کس قدر عجیب ہے۔ محبت
کے نام سے بدلتی ہے، محبت فرانسیسی کلچر کی جان ہے، اب اگر تمہاری
جگہ کوئی فرانسیسی میڈموزیل ہوتی۔ تو جانتی ہو کیا کہتی..... تمہا جانے دو بیٹو

یہ ہندوستان ہے اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور آج کی رات ہماری ہے۔
 ”آج کی رات؟ احمق، تم مجھے گھر پر پہنچا کے آؤ گے نا۔ پاپا انتظار
 کر رہے ہوں گے۔“

”شش..... پاپا کا نام نہ لو، آج کی رات ہماری ہے۔ یہ جینی
 رستوران ہے۔ جینی کھانا ہندوستان میں، اور ہندوستانی کھانا چین میں
 میں جب چنگ کنگ تھا۔ تو ایک ہندوستانی رستوران میں کھانا کھانے
 جایا کرتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔ انڈیا کافے.... انڈیا کافے.... ہائے
 فرانسیسی کافے یاد آتے ہیں ہر روز۔ بار بار۔ ہر لمحے یاد آتے ہیں۔ یہ بھی
 کوئی کافے ہیں نہ وہ نفاست ہے۔ نہ وہ ناز کی نہ وہ گفتار کا لہجہ۔ اپنی سیاری
 میٹھی زبان کو سننے کے لئے ترستا ہوں۔ معاف کرنا، تمہاری انگریزی اس
 طرح بولی جاتی ہے۔ جس طرح پتھر ملی سڑک پر رولر چل رہا ہو۔“
 ”شٹ اپ“

”سچ کہتا ہوں اور سچ کو ہمیشہ شٹ اپ کہا جاتا ہے، ڈور تھکی مجھے
 تم سے عشق ہے۔ مجھے فرانس سے عشق ہے۔ لیکن آج ہم دونوں اکیلے
 ہیں۔ بیرہ ابر کھانا یہاں نیچے رکھ دو۔ نہیں اس میز پر نہ رکھو، کھانا پھر

لکھائیں گے۔ حق تو یہی دیر کے بعد ہی لیکن محبت نہیں رکھ سکتی۔ ابھی لمحے کے لئے نہیں۔ گھبراتا کیوں ہو۔ یہ بیرو آتی انگریزی نہیں سمجھتا؟
 "فرض کرو کہ یہ سمجھتا ہے تو؟"

"تو بھی کیا پروا ہے ہر روز اس ٹبل پر اسی قسم کی گفتگو سنتا ہے

غالباً....."

"تم تو زے غنڈھے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ

یہاں رہتا ہوں میں چلی آئی؟"

"تم بات دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ یہ جھوٹ ہے مگر ہے۔ دفتر

دھکا ہے میں اُسے خوب پہچانتا ہوں۔ سنو دوستی میں تمہیں دانا کوئی نہیں

کوئی اعتراض ہے تمہاری آنکھیں کھلے دی ہیں تمہیں کوئی اعتراض نہیں دوستی

تو کروں کا نام ہوتا ہے نا۔ سنو دانا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ اس سے پہلے

بھی تمہیں کئی انگریز مردوں نے یہ بتایا ہو گا۔ پر آج ایک فرانسیسی کی زبان سے

سن لو تمہارا حسن بالکل نیا ہے۔ اس میں کنوارہ پن کی ٹانگی ہے۔ مجھے تمہاری

آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بالکل منزل اور ان شہ آف چشموں کی گدائیاں اور

یہ دل باریک بینی سے زمروں میں شہد ظہور اور یہ بال، ٹانگہ۔ صحرائی ریت کی

طرح تابناک، آٹا۔ کسی اچھی خوشبو آ رہی ہے ان میں سے
 ”ہٹو۔ مجھے نہ چھوڑو۔“

”کسی اچھی خوشبو آ رہی ہے ان میں سے۔ اچھی۔ پیاری۔ ہلکی نیکیں جیسے
 بحرِ شمالی کی ہواؤں کی تازگی اور خنکی ان میں رہی ہوئی ہے۔ آہ۔۔۔
 بے انگڑ پڑ عورت۔ تو نے کبھی کسی فرانسیسی سے محبت کی ہے۔ نہیں؟ تو
 تو نے زندگی میں محبت کی معراج کھودی ہے۔ مجھے عشق کر۔
 ”سچ مچ بڑے باتوں پر۔ شاید اسی لیے مجھے کچھ پسند ہو۔“
 ”ہاں۔ اب آئیں راہِ راست پر۔ ہر عورت پہلے بٹک جاتی ہے
 پھر راہِ راست پر آ جاتی ہے کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔
 ”تمہارا تجربہ؟“ اُف۔ کس قدر بے حیا ہوں تم۔“

”سچی بات کہتا ہوں۔ اُس ملک کا بیٹا ہوں جس نے انقلاب کی
 پہلی موج کو جنم دیا۔ سچی بات کہتا ہوں وائسا، تم مجھے پسند کرتی ہو میں
 تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اور ہم دونوں اکیلے ہیں اور یہ ہندوستان ہے اور
 آج جنگ ہے۔ اور مرگ کا طبل بج رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میں کل مر
 جاؤں، تم پُرانا سے تبدیل ہو کر اسکندر آباد چلی جاؤ یا مونگھیر یا کوئی اسی قسم

کا ذلیل مقام، پھر آج یہ جو اتفاق سے ہم تم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں۔
 پھر کب مل سکیں گے۔ میں اسے معجزہ نہیں کہتا۔ اتفاق کتا ہوں لاکھوں
 لاکھوں لاکھوں لاکھوں گردشوں کے درمیان دو ذرے ٹکرائے۔ میں اور تم
 آؤ اس لمحے کو مکمل کر لیں ہیں پونا ہو مل میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک
 کمرہ ہے۔ اور چاروں طرف خاموشی ہے۔ زندگی سو رہی ہے۔ کھڑکی میں
 گلاب کی سیلیں ہیں۔ دو بڑے بڑے پھول، دو پاکیزہ آنسوؤں کی طرح
 تمہارے بالوں میں جگمگاتے نظر آئیں گے۔ آہ ڈار رنگ!“

”بھٹی مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے“

”تو آؤ کھانا کھا میں۔ مادی باتوں کا ذکر کرو گی۔ انگریز عورت
 جو ٹھیریں فرانسیسی ہمیشہ محبت کو ترجیح دیتا ہے، انگریز کھانے کو معائن
 کرنا ڈارنگ یہ مادیت تمہارے سراج کی بنیاد ہے۔ جس میں ہندوستان بھی
 شامل ہے۔ کہو اس ملک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں نے دیکھا ہی نہیں اسے ابھی تک، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں

کہ — کہ اس میں بدبو بہت ہے۔“

”بدبو؟ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ ملک بدبوؤں سے بھرا ہوا ہے

اور ہم تم دونوں اکیلے ہیں۔ دو پاک و صاف سفید آریں نسل کے فرد۔ آؤ
بھول جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ہنسی... ہنسی...
”کوئی دیکھ لے گا۔ کوئی سن لے گا۔“

”ہنسی... ہنسی...“

”... روٹی...“

”گٹ آؤٹ پیرہ...“

”پال“

”ہاں پیارے“

”ان سے طو۔ یہ آخر ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شاعر، یہ جادو
ہیں ہندوستان کے بہت بڑے ایکٹر۔ یہ دیاس ہیں۔ ہندوستان کے بہت
بڑے کوئی، یہ انست ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شکاری!“
”اور اس کمرے میں لڑکی ایک بھی نہیں۔ تم لوگ۔ ہندوستان کے
بڑے لوگ عورت کے بغیر زندگی کس طرح بسر کرتے ہو؟“

”ہم میں سے کوئی شخص بھی عورت کے بغیر زندگی بسر نہیں کرتا۔ ہم لوگ

بیوی بچوں والے ہیں۔ ناں بہنوں والے ہیں، عشق بھی کرتے ہیں، اشتاہیں بھی رکھتے ہیں۔“

”مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ معاف کرنا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر ہندوستانی نے اپنی عورت کو خواہ گاہ کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے، مجھے گھٹن سی محسوس ہوتی ہے یہاں، اک عجیب بیکلی غلامیں مجھے ہٹھکھٹ پر دے اور دیواریں نظر آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ اچھا کیا باتوں کیا جی چاہتا ہے۔ سن کر کیا کر دے۔ میں پرہیزی ہوں تم ہندوستانی ہو۔ میں گورا ہوں تم کالے ہو۔ مجھ سے نفرت کرتے ہو گے اپنے دل میں۔ ہر یوہین سے تمہیں نفرت ہوگی۔ میری باتوں پر تمہیں کیز کر اعتبار آئے گا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے پائی۔ ہمیں کسی فرد سے نفرت نہیں۔ ہم تو اسی نظام زندگی سے نفرت کرتے ہیں، جو جائے اور تھائے دیا نفرت کا بیج بوتا ہے۔“

”کتابی باتیں نہ کہو زندگی کی زبان میں بات کرو۔ معاف کرنا دیکھو یہ لوگ، یہ فریچر، تمہاری روحانی غربت اور ذہنی افلاس کا آئینہ دار ہے۔ کیا اس طرح رہتے ہیں۔ مذہب لوگ۔ یہ جھوٹے پھول تیلو ڈالی دری۔ یہ بڑا

آئینہ، یہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی، یہ صوفے جو اب نیلورپی ہیں۔
درایشیائی، یہ کونسی تہذیب ہے۔ کونسا کلچر ہے، کس سترت کی
آئینہ داری کرتی ہے۔ ذرا بتا دو۔ ہم تم اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس
کمرے کی شخصیت کیا ہے؟

مش مش۔ سنبھل کر بات کرو۔ ہوش میں آؤ پاآں۔ یہ کمرہ اختر کی محبوبہ

کا ہے؟

م اختر کی محبوبہ کا ہے؟ ہاٹے خریبی۔ معاف کرنا شاعر تم شاعر ہو۔
تمہارا دل شاعر کا ہو گا لیکن اس کمرے کی روح اس قدر غریب کیوں ہے،
یہ ویران دیواریں، یلگے آئینے، یہ بے ڈول صوفے.....“

”کرا یہ پراٹھا لایا ہوں.....“

”محبت کراٹے سے نہیں خود پی جاتی، یہ محبت نہیں ہے جیوا
نیت ہے، جانتے ہو اگر یہ کمرہ میری محبوبہ کا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں اس کمرے کی
ہر دیوار کو جنسیل کے پھولوں سے ڈھانپ دیتا جنسیل کے نازک پھول جیسے
فرانس کی کنواری..... یا سمن..... تمہارے ملک میں یاسمن کی اس قدر
ہستات ہے۔ اور پھر بھی یہ دیواریں تنگی ہیں۔ یہ آئینہ ننگا ہے۔ یہاں پر کوئی

دیوان نہیں۔ کوئی غالیچ نہیں۔ ہوا میں تعطر نہیں۔ برآمدے میں پتھروں کی بیلین نہیں۔ دروازوں پر چنبیلی کئے پرٹے کیوں نہیں۔ یہ تو ہے کی سلاخیں یہاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ تمھارے محبوب کا مکہ ہے یا جیل خانہ۔ پیارے اختر شاعر۔ بتاؤ تم کس کلچر کی اولاد ہو۔ تم کیا تھے۔ کیا ہو گئے۔ کہھر جا رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس یہ جانتا ہوں۔ تم اپنے افلاس۔ اپنی غلامی۔ اپنی مصیبتوں کے خود مدار ہو۔ معاف کرنا۔ میں سامراج کا حامی نہیں میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں۔ کیا تم مجھ میں کسی قسم کی منافرت کی جھلک دیکھتے ہو؟

» نہیں «

» تو بس جو میں کہتا ہوں اسے ٹھیک سمجھو۔ ہا ہا ہا چائے پلاؤ گے۔ «

» ضرور۔۔۔۔۔ مگر ایک بات کہوں پال۔ تم جب بات کرتے ہو تو تمھارا انچلا ہونٹ بڑے عجیب انداز میں آگے کو پھیل جاتا ہے

— موردس شولیش کی طرح «

» ہر فرانسیسی میری طرح دکش انداز میں اسی دکش انداز میں باتیں کرتا ہے۔ یہ ہماری قومی خصوصیت ہے۔ چارلس بریاں کو فلموں میں کام کرتے

دیکھا ہوگا۔ آہ چارلس بیاں فرانسیسی اندازِ محبت کی تفسیر ہے۔ انگریز جب عشق کرتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ کس قدر پرجہ انداز ہے یہ۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ تم کس قدر حسین ہو یہ عاشق کی زبان نہیں ہے۔ بیکری کے مستری کی زبان ہے۔ جب فرانسیسی عشق کرتا ہے۔ تو خوشبوؤں کی زبان میں اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ یا سمن....

.... یا سمن....“ اختر۔ اس کمرے کو چنبیلی کے پھولوں سے رشک گلزار بنا دو۔ تاکہ جب تمہاری محبوبہ اٹھلائی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو تو تم انکھوں کی زبان میں خوشبوؤں کے سانسوں میں اس سے اظہارِ محبت کر سکو۔“

پال۔ میں چارلس بیاں کا وہ فقرہ کبھی نہیں بھولتا جو اس نے اپنی عہد کی تعریف میں کہا تھا۔ ایک سادہ سا فقرہ ہے۔ لیکن اس سے بہتر جملہ محبت کی زبان میں آج تک ادا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ تم۔ تم میری محبوبہ نہیں ہو۔ تم پیرس ہو۔“

”پیرس..... پری..... پری..... ہائے..... ہائے.....“

اس جملے پر سو جان سے نثار ہوں۔ اختر تم اپنی محبوبہ سے کیا کہتے ہو بھلا؟“

”میں؟۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس خاموش بیٹھا اُسے

تکٹا رہتا ہوں۔“

”یہ ایشیا کی زبان ہے۔ محرومیت کی زبان ہے۔ غریب نظام اور گھٹے ہوئے لوگوں کی زبان ہے۔ پیالے محبت کرنا سیکھو۔ تم خود بخود آزاد ہو جاؤ گے۔ سچ کہتا ہوں۔ یہ چائے بُری نہیں لیکن پیالہ ٹوٹا ہوا ہے۔ تم لوگوں کا دل بُرا نہیں۔ لیکن یہ غول۔ یہ ماحول۔ یہ جسم اسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ میں رنگ کا ذکر نہیں کر رہا۔ فرانسیسی قوم سفید رنگ کی قوموں میں پہلی قوم ہے جو حبشی کے رنگ سے پیار کرتی ہے۔ ہم لوگ دیوار رنگ میں یقین نہیں رکھتے۔ درحالیکہ امریکنوں کے ہاں بھی یہ دیوار موجود ہے۔ میں فرانسیسی ہوں۔ ڈیو کر لسی کا سچا سہا ہی..... اچھا تو یہ بتاؤ۔ تمہیں یورپین عورتیں پسند ہیں۔ کیوں شاعر..... تم سے تو پوچھنا بیکار ہے، اپنی محبوبہ.....“

”نہیں۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ سفید رنگ کی عورتیں پسند تھیں۔“

”اور تم جاؤ۔“

”اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا ماحول..... جسم سے بدبو آتی ہے۔“

ویسے بڑی صحت مند ہوتی ہیں۔

حاور تم شکاری۔ اچھا یہ بتاؤ۔ فلم ایکڑسوں میں تھیں کونسی پسند ہے۔
”انگریڈ برگین“

سکندے نیوین ٹائپ ہے۔ یعنی بالکل تھاری ضد۔ آدمی تضاد کو اتنا
کیوں پسند کرتا ہے، شاید یہ برقی قوت انسان کے اندر بھی کارفرما ہے۔
شاید یہ محبت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثبت اور منفی قوت کی لڑی
اُن کا تضاد۔ محبت۔۔۔۔۔ بد خوب۔۔۔۔۔ ٹھیک تو ہے۔ مجھے دیکھو
میں سفید رنگ کی عورت کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور انگریڈ عورت تو اس
قدر بھدی ہے۔ کہ بالکل نظر سے اتر چکی ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت سے
پیار ہے عشق ہے۔ والہانہ محبت ہے۔ میں ہر ہندوستانی عورت سے
پیار کرتا ہوں۔ ہر ایک سے۔ مجھے ان کا رنگ پسند ہے۔ ان کے بال
پسند ہیں۔ ان کی چال پسند ہے۔ اُن کی ہنسی پسند ہے۔ اُن کی شفقت
پسند ہے۔ اُن کی مامتا۔ اُن کی حیا، اُن کی سمجھ۔۔۔۔۔ اُن کی مظلومیت۔۔
۔۔۔۔۔ یہ یورپی عورت تو بھڑا بڑی بد صورت ہے۔ پوڈرا اور غازے میں
یہی پتی، گندی اور اس کا سایہ اور ٹانگیں نکلیں۔ اور نیلی نیلی رگیں۔ اور

پختے داغ اُن کس قدر گناہنا منظر ہے کہاں وہ دلفریب
سایلوں کا بہاؤ جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی ریت پر وہ قم قم کا
ٹیکہ شاید میں بھی تھواری طرح اپنی ضد کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے
ہندوستان میں صرف اندھرا کی عورتیں پسند ہیں، میں تو کسی ہندوستانی عورت
سے شادی کر دوں گا۔

”بھوٹ بولتے ہو ہال۔ تم کسی فرانسیسی کنواری۔ کسی گیسکاں لڑکی
سے شادی کرو گے اور جنگ کے بعد فرانسیسی شراب کی تجارت کرو گے۔
ہندوستان میں بھلا تم کیا رہو گے ؟

”یہ سچ ہے۔ میں فرانس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میں۔ میں ہندوستان
کی ایک دیوی کو فرانس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرا ملک
اس کا استقبال کرے گا۔ میرا خیال ہے میرے ماں باپ اُسے پسند
کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پھرے ساتھ خوش رہ سکے گی میں ہندوستان
کی رُوح کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا
ہوں۔ اُس کے لیے میں ایک چھوٹا سا مندر بنواؤں گا فرانس میں۔ یہ
فرانس اور ہندوستان کی شادی ہوگی۔“

» وہ شادی جوڑو پلے اور لالی اور نہولیں نہ کراسکا.....! «
 ”تم بھرتے ہو پیاسے میں وہ فرانسیسی نہیں ہوں۔ میں روسو اور
 والتیر کا فرانس ہوں۔ میں سامراجی نہیں ہوں۔ میں ڈیموکریسی کا سپاہی
 ہوں۔ آؤ چلو کہیں چل کر تھوڑی سی شراب پیئیں۔ اور کسی ہندوستانی
 لڑکی کا ناچ دیکھیں۔ مجھے ہندوستانی بازار بہت پسند ہیں۔ اور وہ
 سُرخ سُرخ پرے جن کے اندر وہ ہندوستانی لڑکیاں ناچتی ہیں...
 چھی جھم جھم جھم اااااا!“

”پال“

”جھم“

”یہ تے کلیر کے بالے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“
 » بہت اچھا فلم ڈائریکٹر ہے۔ فرانس کا بہترین ہدایت کار۔ جسے
 ملٹی وڈ نے تباہ کر دیا یہی ہوتا ہے، جب کوئی فرانسیسی اپنے ملک سے
 باہر جاتا ہے۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ قوم اسی طرح تباہ ہوئی ہے۔ تمہیں
 معلوم ہے۔ میں رینے کلیر کا اسٹنٹ رہ چکا ہوں۔“

”نہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔“

”اُس کے لیے میں ایک کہانی بھی لکھ رہا تھا۔ پھر جنگ سر پڑ گئی۔“

اور سب کچھ رہ گیا۔“

”اُس کہانی میں کیا تھا۔“

”ماں اور بیٹی دونوں کو ایک ہی آدمی سے عشق ہے اور یہ آدمی

اُس کی ماں کا ناجائز خاوند ہے یعنی اس بیٹی کا باپ۔“

”بہت خوب۔ پھر کیا ہوتا ہے۔“

”پھر — مگر یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے۔ کو بیٹی

اور باپ خاوند اور بیوی کی طرح ہوتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ شادی نہیں ہو سکتی مگر

اس سے کیا ہوتا ہے۔ محبت لزوال ہے — بیرہ! دو لارچ دسکی لاؤ.....“

”پال تم آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“

”ایک بات ہے تمہیں بتانا چاہتا تھا، مگر میں نے سوچا چوتھے

پہلے کے بعد بتاؤں گا۔“

”کہو۔“

”میں کل صبح ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں فرنگی سیرا

جارا ہوں ۛ

• اس میں خوشی کی کیا بات ہے ۛ

”یہی کہیں فرنج سیریا جارا ہوں۔ ہندوستان پھوڑا ہوں۔ وہاں سے بھوروں کا منظر شروع ہوتا ہے۔ پیرس دو قدم پر ہے اور پھر کچ پچھو تو وہ فرنج سیریا ہے۔ اپنا ملک ہے ۛ

• ہال وہ تمہارا ملک کس طرح ہے ۛ

”کیا کہتے ہو تم ۛ

”غور کرو۔ فرنج سیریا تمہیں ان غفلوں میں کچھ دکھائی دیتا ہے۔ باہر سے مت پڑھو ان غفلوں کو۔ انہیں اندر سے پڑھو پائل۔ فرنج سیریا.... فرنج کیوں تمہیں اس میں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے۔ فرنج سیریا برٹش انڈیا، ڈچ بورنیو، تمہیں ان خوش رنگ، چمکتے ہوئے الفاظ کے پردوں میں کہیں تاریکی کی جھلک نظر آتی ہے؟

”لوو سکی پیو....“

”پائل تم کل جا رہے ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔ تم ایک ذہنی فراموشی ہو۔ تم یورپ کے کلچر۔ تہذیب اور مذہب کا بہترین آئینہ ہو۔ شراب پیو،

دوست تم کل فریج سیر یا جا ہے ہو۔ تاہم کایہ تو اتر ڈیڑھ دو سو برس سے چلا
آ رہا ہے۔ ڈیڑھ دو سو برس کیا ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ دو سو ڈیڑھ دو سو لمحے، کچھ بھی
نہیں دوست۔ پھر اگر کل کو یہ تو اتر بدل جاوے۔ اور کوئی سہا ہی تم سے کہے
میں جیسی فرانس۔ ہندی برطانیہ اور جیسی اٹالیہ میں جا رہا ہوں۔ تو تمہیں
خوشی حاصل ہوگی؟

”بہت پی گئے ہو شاید پی کر تمہارا احساس کتری بڑی بڑی لگتا ہے۔“
”احساس کتری نہیں۔ احساس برتری بول رہا ہے۔ آج معلوم ہوا
تم کتنے چھوٹے ہو۔ تمہاری تہذیب وقتی ہے۔ تمہاری خوشی وقتی ہے
تمہاری فوقیت وقتی ہے دوست تم مر چکے ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے دل میں
نا انصافی اور ظلم اور بے رحمی کو جگہ دی ہے۔ ذلیل ہندوستانی!.....
..... پال مجھے گھونسا مت دکھاؤ، اُسے اُس ہندوستانی عورت کے لیے
سنبھال کر رکھو۔ جس کے لیے تم فرانس میں مندر بنا رہے تھے۔ وہ مندر
کب کا سمار ہو چکا۔ وہ مندر جس میں روسو اور والٹیئر کی رُوح نے جہنم یا
نقا میں ذلیل ہوں لیکن زندہ ہوں۔ تم ارفع ہو لیکن مر چکے ہو۔ اور مجھے
مردوں سے کوئی ملاؤ نہیں جاؤ فریج سیر یا جاؤ، یا ڈیج السریقہ،

تیسری جنگِ عظیم تھاوار انتظار کر رہی ہے۔ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے۔ اُسی طرح وقتی صلح کے بعد پھر جنگ آئے گی۔ کیونکہ پال تم ابھی تک نفرت کے قبرستان میں سو رہے ہو۔ مجھے روکو نہیں۔۔۔ مجھے بولنے دو۔ آج میری باری ہے اور تم فریج سیر یا جا رہے ہو اور ہم دونوں وکیل ہی رہے ہیں، ایک زندہ ایک مردہ۔ ایک ذلیل، ایک بے رحم، بٹھراؤ پال۔۔۔ یہاں سے اٹھ کر کہاں جا رہے ہو۔۔۔ اپنے دوست کا آخری سلام تو لیتے جاؤ۔۔۔۔۔ سنو میں اکیلا نہیں ہوں پال، میں چالیس کروڑ ہوں۔۔۔ میں نفرت نہیں ہوں میں محبت ہوں۔ میں نبولین نہیں ہوں۔ میں اشوک ہوں۔ میں اکبر ہوں۔ میں گوتم ہوں چشتی ہوں۔ کبیر ہوں کبیر کا نام سنا ہے تم نے؟ سنئے جاؤ پال، میں اجنتا ہوں ایورا ہوں۔ میں تاج محل ہوں۔۔۔۔۔ میں محبت ہوں۔ عشق و انسانیت کی تفسیر ہوں، تم آزاد ہو کر بھی محبت نہیں کر سکتے۔ میں غلام رہ کر بھی تم سے محبت کرتا ہوں، میرا گھر بڑا ہے۔ میرا دل بڑا ہے، میری روح عظیم ہے۔۔۔۔۔ بٹھراؤ پال۔ یہ چنیل کے پھولوں کا ہار لیتے جاؤ۔ ایک ذلیل ملک کا آخری تحفہ۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ سنو پال! پال!

ہال

میں تمہیں اُس قیصری جنگِ عظیم سے بچانا چاہتا ہوں۔ سنو پال۔ مجھے تم سے
نفرت نہیں ہے۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ اُ

غالیچہ

اب تو یہ غالیچہ پرانا ہو چکا، لیکن آج سے دو سال پہلے جب میں نے اسے حضرت گنج میں ایک دکان سے خریدا تھا اس وقت یہ غالیچہ بالکل معصوم تھا، اس کی جلد معصوم تھی، اس کی مسکراہٹ معصوم تھی، اس کا ہر رنگ معصوم تھا، اب نہیں، دو سال پہلے، اب تو اس میں زہر گھل گیا ہے، اس کا ایک ایک تار مسموم اور متعفن ہو چکا ہے، رنگ ماند پڑ گیا ہے، تبسم میں آنسوؤں کی جھلک ہے، اور جلد میں کسی آتشک زدہ مریض کی طرح جابجا گڑھے پڑ گئے ہیں، پہلے یہ غالیچہ معصوم تھا۔ اب قنوطی ہے، زہر خند، ہنسی مہنتا ہے، اور اس طرح سانس لیتا ہے، جیسے کائنات کا سارا کوڑا کرکٹ اس نے اپنے

سینے میں چھپا لیا ہو۔

اس خالیچے کا قد نو فٹ ہے، چوڑائی میں پانچ فٹ، بس جتنی ایک اوسط درجے کے پٹنگ کی چوڑائی ہوتی ہے، کنا راہ کو ربادامی ہے اور ڈیڑھ انچ تک گہرا ہے، اس کے بعد اہل خالیچہ شروع ہوتا ہے اور گہرے سرخ رنگ سے شروع ہوتا ہے، یہ رنگ خالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلا ہوتا ہے اور دو فٹ کی لمبائی میں ہے، گویا 2×5 فٹ کی مستطیل، سرخ رنگ کی ایک جھیل بن گئی ہے، لیکن اس جھیل میں بھی سرخ رنگ کی جھلیاں، کئی رنگوں کے تماشے دکھائی ہیں، گہرا سرخ، گلابی، ہلکا قرمزی، اور سرخ جیسے گندہ خون ہوتا ہے، لیٹتے وقت خالیچے کے اس حصے پر میں ہمیشہ اپنا سر رکھتا ہوں، اور مجھے ہر بار زیادہ احساس ہوتا ہے، کہ کیسے سر میں جو نکلیں لگی ہیں۔ اور میرا گندہ خون چوس رہی ہیں۔

پھر اس خونی مستطیل کے نیچے پانچ اور مستطیلیں ہیں، جن کے الگ الگ رنگ ہیں۔ یہ مستطیلیں خالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلی ہوتی ہیں، اس طرح کہ آخری مستطیل پر خالیچے کی لمبائی بھی ختم ہو جاتی ہے، اور دوسری کی کہ شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔ خونی مستطیل کے بالکل نیچے تین چھوٹی چھوٹی

مستطیل ہیں، پہلی سپید اور سیاہ رنگ کی شطرنجی ہے۔ دوسری سپید اور نیلے رنگ کی، تیسری بلوریک اور خاک رنگ کی، یہ شطرنجیاں دور سے بالکل چمچک کے داغوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں، اور قریب سے دیکھنے پر بھی ان کے حسن میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیلام شدہ پائے گرم کوٹوں کی جلد کی طرح میلی میلی اور بد نما نظر آتی ہیں۔ پہلی مستطیل اگر خون کی جھیل ہے، تو بہتین چھوٹی چھوٹی مستطیدیں مجموعی طور پر پیپ کی جھیل کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ان کے سپید، کالے، پیلے، بلوریک رنگ پیپ کی جھیل میں گڈاڑتے نظر آتے ہیں، اس جھیل میں میرے شانے، میرا دل، اور میرے پچھڑے پسلیوں کے کبھی ہیں دھرے پڑتے ہیں۔

جو تھی مستطیل کا رنگ پیلا ہے اور پانچویں کا سبز ہے، لیکن ایسا سبز ہے جیسے گرے سمندر کا ہوتا ہے، ایسا سبز نہیں جس طرح موسم بہار کا ہوتا ہے یہ ایک خطرناک رنگ ہے، اسے دیکھ کر شارک مچھلیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ڈوبتے بچے جہاز رانوں کی جینیں سنائی دیتی ہیں، اور اُچھلتی ہوئی طوفانی، دیو ہیکل لہروں کی گونج اور گرج رعشہ پیدا کرتی ہے اور پیلا مٹیالا رنگ تو سنخوس سمی۔ یہ رنگ زعفران کی طرح، بسنت کی طرح پیلا نہیں

یہ رنگ مٹی کی طرح پیلا ہے، تپن کے لرین کی طرح پیلا ہے، پہلے گنا کی طرح زرد ہے، ایک ایسا زرد رنگ جس میں شاید اک ہلکا سا احساس ندامت بھی شامل ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مستطیل بار بار کمرہ ہی ہو۔ میں کیوں ہوں، میں کیوں ہوں.....

جہاں میں اپنا احساس رکھتا ہوں، اُس کے دائیں کونے میں نیلے اور پہلے رنگ کے دس خطوط وحدانی بنے بچھے ہیں، اور جہاں میں اپنے پاؤں پسار کے سوتا ہوں، وہاں گیارہ خطوط وحدانی ہیں۔ یہ پہلے اور فیروزی رنگ کے ہیں، غالیچے کے وسط میں چھ خطوط وحدانی سرخ و سپید رنگ میں ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گہرا سیاہ نقطہ ہے..... جب میں غالیچے پر لیٹ جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سرے پاؤں تک کسی نے مجھے ان خطوط وحدانی کی بکوں میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے صلیب پر لٹا کر میرے دل میں ایک گہرے سیاہ رنگ کی میخ ٹھونک دی ہے چاروں طرف گندہ خون ہے، پیپ ہے، اور سبز رنگ کا سمندر ہے جو شارک مچھلیوں اور سمندری ہزار پاؤں سے معمور ہے، شاید مسیح کو بھی صلیب پر اتنی ایذا پہنچی ہوگی، جتنی مجھے اس غالیچے پر بیٹھے وقت حاصل

ہوتی ہے، لیکن ایذا پہستی تو انسان کا شیوہ مستحق، اسی لیے تو یہ غالیچہ میں اپنے لئے
آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ نہ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی اور غالیچہ خریدنے
کی جرات ہوتی ہے۔ میرے پاس ہی ایک غالیچہ ہے اور میرا خیال ہے کہ
مرنے دم تک ہی ایک غالیچہ رہے گا۔

اس غالیچے کو دراصل ایک خاتون خریدنا چاہتی تھی، حضرت گنج میں
ایک دکان کے اندر وہ اسے کھلوا کر دیکھ رہی تھی، کہ میری نگاہوں نے
اسے پسند کر لیا، اور وہ خاتون کچھ فیصدہ کمزری اور اسے وہیں چھوڑ کر اپنے
بلڈز کے لیے ریشمی کپڑے دیکھنے لگی۔

میں نے منہجہ سے کہا: ”یہ غالیچہ میں خریدنا چاہتا ہوں۔“
وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ مس روپ وقتی — شاید
اسے پسند کر چکی ہیں۔ شاید! — — — — — بھڑیے۔ میں اُن سے پوچھتا
ہوں۔

روپ وقتی بولی: ”غالیچہ — برا نہیں!“
”برا نہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے بھڑک کر کہا: ”ایسا
غالیچہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہوگا۔ دانے کے تھیلے نے بھی ایسا نقشہ

تیار نہ کیا ہو گا، یہ غالیچہ ہسپتال کی گندے بالٹی کی طرح حسین ہے، امراضِ خبیثہ کی طرح رُوح پرورد ہے، یہ آگ اور پیپ کا دریا حتمِ طائی کے سفر کی یاد دلاتا ہے۔ قدیم اطالوی راہب مصوروں کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ غالیچہ نہیں ہے۔ تاریخ ہے، انسان کی رُوح کی!"

وہ مسکرائی، دانت بے حد سفید تھے، لیکن ذرا ٹیڑھے میڑھے اور ایک دوسرے سے بہت قریب، پھر بھی وہ مسکراہٹ اچھی معلوم ہوئی کہنے لگی: کیا آپ کبھی اٹلی گئے ہیں؟

میں نے کہا: اٹلی کہاں! میں تو کبھی حضرت گنج کے اس پار نہیں۔
 گیا عمر گزری ہے اسی پرانے میں، یہ پان کی کان ہے اور سامنے وہ کافی ماؤس۔
 منیجر نے اب تعارف کرانا مناسب سمجھا۔ بولا: آپ آرٹسٹ ہیں۔
 کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ مس روپوتی ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے کالج میں
 پرنسپل ہو کر آئی ہیں۔ ابھی انگریڈ سے تعلیم چل کر کے یہاں....
 وہ بولی: چلتے تو یہ غالیچہ آپ ہی لے لیجئے مجھے تو خاص پسند نہیں۔
 "آپ کا بڑا احسان ہے" میں نے غالیچے کی قیمت ادا کرتے ہوئے
 کہا: کیا آپ میرے ساتھ— کافی پینا گوارا کریں گی، چلتے ناؤر کافی ماؤس

تک، اگر ناگوار خاطر، یعنی —

”شکر یہ مگر میں خورایہ بلاؤز دیکھ لوں“ وہ پھر مسکراتی۔

مسکراہٹ بھی بھلی معلوم ہوئی، ذہین بیضری چہرے کا رنگنے دھنا،
صندلی رنگ پر لبوں کی ہلکی سی سُرخی اک عجیب سیلا توج سا پیدا کر
رہی تھی بلاؤز کا کپڑا خرید کر جب وہ میرے ساتھ چلنے لگی، تو لڑکھڑا گئی۔
میں نے بانہرے کے پکڑ کر سہارا دیا اور پوچھا ”کیا بات ہے۔ کیا آپ ہمیشہ
لڑکھڑا کر چلتی ہیں؟“

وہ بولی ”نہیں تو۔۔۔۔۔“ میں نے غور سے دیکھا۔ پاؤں پر پیٹی بندھی
ہوئی تھی۔

”زخم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں مانگوٹھے کا ناخن بڑھ گیا تھا۔ جلد کے اندر۔۔۔ جہاز کا سفر
بالکل گدھا تھا۔۔۔ اُس نے مٹھے پر ساری کاپڑ مسرکایا اور جب وہ چل بار
ٹری تھیں نے دیکھا اُس کے بالوں میں گڑن کے قریب ائیں طرف کلاچ کے
زرد پھول ٹپکے پھوٹے تھے، پھر جب وہ مڑی تو ماتھے کا قلم دھشاں
نظر آیا۔ اس سے پہلے کیوں یہ قلم قلم اس قدر خوبصورت نہ تھا؟

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت تھی، کچھ تو کافی ہاؤس میں روشنی کا انتظام ایسا ہے کہ مرد بد صورت نظر آتے ہیں، عورتیں حسین تر پھر۔۔۔ ہاں۔۔۔ کچھ تو تھا، ورنہ یہ لوگ بار بار ڈر کریوں دیکھتے تھے عورتیں تیز نگاہ سے کیوں گھورتی تھیں، جسے اتنی جلدی مینر پر کیوں آجاتے تھے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی۔۔۔۔۔ ”دیکھو بھرا، تھوڑا سا گرم دودھ اور گرم پانی ایک انگ پیالے میں۔“

”گرم پانی تو۔۔۔“ بیرے نے رک کر کہا۔

”تھوڑا سا گرم پانی، پس!“ وہ پھر مسکرائی، اور میرا سر سے لے کر پاؤں تک پھسل گیا، جیسے اُس کا سارا جسم شیشے کا بنا ہو، میں اُسے بگھنٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور اُس کے سارے جسم کو چمکلاتی ہوئی چلی گئی، یہ نگاہ کیا ہے؟ یہ تجلی کیسی ہے؟ کیا یہ کافی ہاؤس کی بکلیوں کا شعبہ تو نہیں؟

”اور میرا۔۔۔ انڈے کے سینڈویچ!“ وہ پھر بولی۔

بیرے نے واپس آکر کہا: ”جی انڈے کے سینڈویچ تو ختم ہو گئے۔“

”تھوڑے سے بھی نہیں؟“ اُس کی بڑی بڑی معصوم زخمی سی آنکھیں

غالیچہ

اور بھی کھلتی ہوئی معلوم نہیں، بس لاپارہ ایک پلیٹ بھی نہیں؟
سینڈ وچ بھی مل گئے۔

”نہیں بل میں ادا کروں گی“

”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں مرد ہوں“

وہ ہنسی بہت پرانی بات ہے ”اور اس نے بل ادا کر دیا۔

گھر پر نوکر کو غالیچہ پسند نہ آیا۔ ان دنوں ایک تنگ مزاج شاعر سہان
تھا جو آزاد بھر میں نقیض لکھا کرتا تھا۔ شہر اب پیٹا تھا اور پانچ وقت نماز ادا
کرتا تھا، اُسے بھی غالیچہ پسند نہ آیا۔ میں نے پوچھا تو بس ”ہوں“ کر کے رہ
گیا، وہ نظیں جتنی لمبی لکھتا تھا، باتیں اُسی نسبت سے کم کرتا تھا۔

”ہوں“ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے چڑ کر کہا ”کچھ تو کہو ان رنگوں

کا مناسب“

”ہوں“

رُڈ پ اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

اُس سڑے لئے شاعر سے کہنے لگی، ”پن تازہ نظم مناؤ..... تمہیں معلوم ہے

آج کل اسپنڈرا وڈ لاؤن اعلیٰ میت کے حق میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔
 ”ہوں“ وہ اپنی داڑھی پر ہات پھیر کر غرا یا۔

میں نے روپ سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا ان لوگوں
 نے تمہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں؟“
 ”نہیں۔ لیکن مجھے جو نے بتایا تھا۔“

”کون؟ جو؟“

”جو براؤن، نام نہیں سنا ہے کیا؟ آج کل آکسفورڈ کا محبوب ترین
 شاعر ہے، ہندوستان میں ابھی اُس کا کلام نہیں پہنچا، لندن میں مجھ پر عاشق
 ہو گیا تھا، وہ کچھ عیب، کچھ میاں، کچھ شریلی سی منہسی کے ساتھ کہنے لگی، او
 ماتھے کا قلم یا قوت کی طرح دکھنے لگا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہاری زندگی فتوحات سے پر معلوم ہوتی ہے؟“
 ”نہیں۔“ اُس نے آہ بھر کر کہا۔ اس طرح کہ میرا جی چاہا اُسے گلے
 سے لگاؤں۔

”ہوں“ شاعر بولا۔

روپ مسکرا کر کہنے لگی۔ ”تمہارا شاعر بہت باتنی ہے۔۔۔۔۔“

..... سنو..... تمہیں ایک نظم سنانی ہوں :-

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی میں نے پوچھا : ”تم شاعر بھی ہو۔“

”نہیں یہ نظم میری والدہ نے کہی تھی۔“

”عشرو۔ مجھے یہ غالیچہ بچپا لینے دو۔“

غالیچہ سمجھ گیا اور نظم روپ نے لگا کر سانی، بنگالی نظم تھی، اُداس محزوں
شبِ فراق کی جلی ہوئی شمع کی طرح خوبصورت تھی، آواز شعلے کی طرح
لرزاں، تاثر شراب کی طرح خمار انگیں، بنگالی و ڈیشیزائیں قطار اندر قطار
گھڑے اٹھائے ہوئے گھاٹ کی طرف جا رہی تھیں سمندر کی ہنر لہریں
اچھل رہی تھیں۔ شرجی کا ڈمرو بج رہا تھا، پارہتی رقص کر رہی تھیں، برف گر
رہی تھی..... اب فضا خاموش تھی اور روپ کی آنکھوں میں آنسو تھے
..... آنسو رخساروں سے ڈھلک کر غالیچے پر گر پڑے اور وہ سرخ
مستطیل جیسے آگ کا شعلہ بن گئی۔۔۔۔۔

”تمہیں جو براؤن سے عشق نہیں ہوا“ میں نے پوچھا۔

روپ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولی مجھے جس لڑکے سے عشق تھا
اُسے لندن ہی میں تپ دق ہو گیا تھا۔ وہ جہاز پر میرے ساتھ آ رہا تھا، لیکن

راستے ہی میں اس کی موت ہو گئی، عدن سے پرے بکھرے سرخ میں! ”
 ”بکھرے سرخ“ میں نے سوچا۔ اور غالبچے کی سُرُخِ مستطیل بکھرے سرخ
 بن گئی، اور اس کے گہرے پانیوں میں مجھے اک زرد رُو کھانسا ہوا چہرہ نظر
 آیا، اور پھر بھنور میں غائب ہو گیا، مجھے خواب ہے۔ مجھے خواب ہے رُخ کا
 محبوب، سرخ سمندر کے پانیوں میں، اور روپ کے آنسو میرے غالبچے
 بدلے ہوئے ہیں۔ . . .

”ہوں و شاعر نے کہا۔ اور میں نے ایک کتاب اس کے سر پر ڈال دی۔“
 روپ آنسوؤں میں سکر لوی، بعض اوقات آنسو رونے سے آنسو مینا
 زیادہ اندوہناک معلوم ہوتا ہے!

روپ!

کیسی عجیب سی لڑکی تھی وہ، لندن میں شاعر جو براؤن اُسے محبت کرتا
 تھا، نور کھنڈو میں ہفتہ گنج کا یہ آوارہ مزاج غریب آرٹسٹ اس کی محبت
 میں گرفتار ہو گیا، یہ جانتے تھے بھی کہ یہ زہر ہے وہ کس طرح اس پہلے
 کو پی گیا، یا سیت، نامراد ہی بے بسی، عشق کا جواب ہمیشہ عشق کیوں

نہیں ہوتا، یکسی اگ سے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برکت کی سل بن جاتی ہے جو محرم تنا کو آسور لاتی ہے اور جانِ مٹنا کے لبوں پر بسم ریز سایہ بھی نہیں لاسکتی۔

میں نے غالیچے کو تھپکتے ہوئے پوچھا۔

خانیچہ نے کہا۔ میں صلیب ہوں، میں دکھ اور درد جانتا ہوں۔ دکھ اور درد کی دوا نہیں جانتا!

اور روپا نے کہا۔ ”یہ قسمت ہے، قسمت تمہیں غالیچہ خریدنے کے لیے دیاں لے گئی، قسمت نے تمہیں مجھ سے روشناس ہونے کا موقع دیا، اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ مجھے تم سے وہ محبت نہ ہو سکی، ہزار کوشش کرنے پر بھی یہ رفاقت محبت میں مبتدل نہیں ہو سکتی۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے؟“

پھر کہنے لگی۔ ”شاعر اپنے شعر سناؤ۔“

چند روز کے بعد اس نے یکایک مجھ سے کہا۔ ”مجھے تمہارے شاعر سے محبت ہو گئی۔ ہے۔“

”جھوٹ..... اس چنڈ سے.....“

اس کی آنکھیں دیکھیں تم نے۔ ”وہ آہ بھر کر بولی۔“ جیسے مسخ دار پر

لٹکا ہر کتہہ اندوہ ہے آن میں !

میں نے کہا : ”اگر تم کہو تو میں اپنی آنکھیں اندھی کر دوں“
 شاید میری ٹہنی اُسے ناگوار گزری۔ سنجیدہ رُو ہو کر بولی : ”کیا کروں ؟“
 ”ہاں دل ہی تو ہے !“ میں نے طنزاً کہا۔
 ”ہوں“ شاعر بولا۔

جس روز وہ دونوں رخصت ہوئے، میں نے گھر پر ایک چھوٹی سی
 دعوت دی، روپے ڈھاکے کی سیاہ ساری پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں
 کاجل گہرا تھا۔ روشنی چوڑیوں کا رنگ بھی سیاہ تھا، ہر روز اُسے دیکھ کر اُجھالے
 کا، سوچ کا، چاند کا، چاند کی کرن کا، روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے آج
 اُسے دیکھ دیکھ کر کیوں تاریکی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیوں وہ اس اپنی مکمل
 کامرانی کے لمحوں میں بھی ٹھہم پاس و غم کی تصویر دکھائی دیتی تھی کیا یہ
 غریب آرٹسٹ کے دل کا اندھیرا تو نہیں تھا۔ کیا یہ اُس کے بُرش
 کی تاریکی تو نہ تھی ! آج میں نے اُس سے دہری گیت سننے کی تمنا کی تھی جو اس
 نے پہلے روز گایا تھا..... مجھے یاد ہے گانے کے بعد وہ ناچی بھی تھی
 میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، میں اس کے پاؤں دیکھتا رہا، دھندلے

غالیچہ

دھندلے تاریک سے پاؤں جن میں حنا کی سُرخ لکیر بکلی کی طرح چمک چمک جاتی تھی، اُس تاریکی میں صرف یہاں روشنی تھی، وہ ناچتی رہی، اور میں اُس تاریکی میں حنائی لکیر کا ناچ دیکھتا رہا۔ اور جب ناچ بھی بند ہو گیا تو میں نے وہ پاؤں اٹھا کر اپنے سینے میں رکھ لیے، کیوں یہ پاؤں آج تک اس سینے میں محفوظ ہیں..... کیا اس اہرام میں میموں کے سوائے اور کسی کے لیے جگہ نہیں؟

جب وہ چلی گئی تو میں پھر غالیچے پر آ بیٹھا، زرد گلاب کی ایک کالی اس کے جوڑے سے نکل کر غالیچے پر پڑی رہ گئی تھی..... میرے دل میں شاید اب روپ کی کوئی یاد باقی نہیں، صرف یہ دو پاؤں ہیں اور اک یہ گلاب کی زرد کالی..... کیسی تصویر ہے یہ؟ مصوّر ہو کر بھی میں نے شاید ایسی عجیب تصویر اس سے پہلے کبھی نہ بنائی تھی..... پھر؟

میں غالیچے سے پوچھتا ہوں۔

غالیچہ کہتا ہے: ”میں تو صلیب ہوں، صلیب موت بخشی ہے، اُسے زندگی کی ترتیب، تناسب، توازن سے آگاہی نہیں.....“

اچھا اسے بھی جانے دو جو ہوا سوہا، اگر زندگی میں قبر ہی کا مزہ لینا ہے
تو کیوں نہ اسے آرام سے حاصل کیا جائے، اگر شہد میں زہری ملا کے پینا ہے
تو کیوں نہ خالص نہر پیا جائے، اگر معصومیت برقرار نہیں رہ سکتی، تو کیوں
نہ گہری مصیبت کی آغوش میں پناہ لی جائے، آؤ، اپنے دل میں ضمیر کی جواک
بلکی ہی شمع رہ گئی ہے۔ اسے بھی خاموش کر دیں اور بڑھتی ہوئی تار کی میں گناہ
کے پھیلنے سمجھتے دو دو دیکھیں اور زندگی کا منہ چڑائیں اور قہقہے لگائیں۔

محبت نہ سہی، برا الہوسی سہی!

آرٹسٹ نے اک اور لڑکی سے آشنائی پیدا کر لی، جو ویکسٹن ڈام
تھی، اس کا نام تھا آشا، لیکن صورت پر بالکل نرا شاہ رستی تھی، ایسی بھوکی
لڑکی تھی وہ، کبھی مرد دیکھا ہی نہ تھا، گتیا کی طرح ساتھ ساتھ لگی پھرتی تھی،
بے پاری، آرٹسٹ کو شاید اس پر رحم آنے لگا تھا، وہ اس کے ساتھ شفقت برتنے
لگا، اک مرتبہ نہ پورا نانا ڈانز کے ساتھ اب وہ اسے ہر جگہ ایسے پیڑتا،
لوگ طنزاً اس کے حسن انتخاب کی داد دیتے، اور وہ بخاطر بڑے خلوص سے
داد قبول کرتا، کوئی کہتا، بھئی، بڑی بد صورت ہے وہ، تم نے کیا سوچ
کر۔ تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتا، گھنٹوں اس کی خوبصورتی کا تجربہ کرتا، کوئی سے

اُس نے اُشاک کی تصویر بنائی تھی اور اپنے سٹوڈیو میں ہر کس و نا کس کو وہ تصویر دکھانا تھا۔ وہ اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ دیکھو... دیکھو... دیکھو... مجھے تمھاری کیا پروا ہے..... میں اپنی روح کا آپ مالک ہوں.....

..... زہر خند!..... کوئلے! لیکن وہ جو کبھی حضرت گنج کے اُس پار نہ گیا تھا۔ اب وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا، فٹ پاتھ پھٹتے چلتے وہ ہزاروں اٹے سیدھے خواب دیکھنے لگا، رنگد رکھ رہتے پر اُسے کسی کے پیروں کے دھندلے دھندلے سائے کانپتے ہوئے معلوم ہوتے، کافی کی پیالی کے برسانس میں وہ اُس کے گرم سانس کا مس محسوس کرتا، اور برقی شمع دانوں کے برق احتلا میں اسے ہزاروں قم قم تیرتے ہوئے دکھائی دیتے یہ ہنسی؟ وہ مڑ کر دیکھتا کہاں سے آئی تھی، لیکن یہ تو وہی کشمیری پالتو مینا اپنے پنجرے میں چپک رہی تھی، بلبل قفس کی تیلیاں توڑ کر پرواز کر گئی تھی اور وہ ابھی تک کیوں حضرت گنج کے دیرانے میں مقید تھا... کیوں؟ کیوں؟ وہ حنائی لکیر بار بار بجلی کی طرح چمک کر اس سے بار بار پوچھ رہی تھی!

اب جبکہ وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا اس نے اپنے سب ستوں کو اس

دیک لڑکی کو، اور اُس کی سب سہیلیوں کا آخری دعوت دی تھی، اور جب دعوت کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ تو دیک لڑکی حیران و پریشان اسی غالیچے پر بیٹھی رہی تھی، اور پھر یکایک اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی تھی یہ گرم گرم آنسو جو اُس کے سینے میں برف کے پھول بنے جا رہے تھے، عشق کا جواب عشق کیوں نہیں ہوتا، کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سل بن جاتی ہے۔

ایک لڑکی غالیچے پر بیٹھی تھی، بازو اوپر کے خطوط و صدافی کے ٹک میں تھے پاؤں نیچے کے خطوط و صدافی میں، غالیچے نے چپکے سے اس کے دل میں اک سیاہ میخ ٹھونک دی، ابرام کے لیے ایک اور می تیار ہو گئی، لیکن وہاں جگہ کہاں تھی، سینے میں اب بھی وہی دو پاؤں نالچ رہے تھے.... اور وہی گلاب کی اک زر دکلی!

میں نے غالیچے سے پوچھا ”کیسا کھیل ہے؟ میں کس کا منہ چڑا رہا ہوں یہ زخم کس کے ہیں، یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے؟ اگر یہ سب قسمت ہے تو پھر یہ کاوش پیہم کیا ہے جو می کو بھی زندہ کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔“ غالیچے نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میں تو ایک صلیب ہوں۔“

غالیچہ

جودل میں سیاہ کیل ٹھونکتی ہے، سپید روشنی نہیں لاتی، جو قسمت کا انجام
دکھاتی ہے، اُس کا آغاز و شباب نہیں!
تجھے جلا کر خاک نہ کر ڈالوں!

اس نئے شہر میں!
چار آدمی غالیچے پر تاش کھیل رہے ہیں۔
دو ایکٹر
دو تجارتار

اور جو تماشا دکھا رہا ہے وہ آرٹسٹ ہے!
تاش کھیلتے کھیلتے ایکٹر اور تجارتار لڑنا شروع کرتے ہیں، ہاتھ پائی
کی نوبت آتی ہے، غالیچہ نوچا جاتا ہے، کیونکہ ایکٹ جالی میں ایک تجارتار غلطی
سے یا جان بوجھ کر آٹھ آنے زیادہ لے گیا تھا، میرا گریبان تار تار ہو چکا
ہے، کیونکہ جو آدمی لڑائی رفع کرنا چاہتا ہے، وہی سب سے زیادہ ہٹتا ہے۔
پھر میں سوچتا ہوں۔ اس بد مزگی کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے، بد مزگی،
ناممکن، گراموفون؟ واہیات! اچائے! العنت! شراب، سہان اللہ!

سب لوگ شراب پی رہے ہیں، آرٹسٹ کی آنکھیں سُرخ ہیں، ہمیشہ
ہنسنے اور خوش رہنے والا خوش شکل ایکٹر ہمیشہ چپ ہنسنے والے قبول صورت
ایکٹر سے کہہ رہا ہے: ”عجبت، عجبت؟ سالانہ صحبت کیا جائے ابھی کالج
کا نوٹا ہے تو..... ایس..... صحبت کا نشہ مجھ سے پوچھ..... سالی؟“
شراب بھی بالکل تلخ نہیں ہے۔۔۔ رانی کو دیکھا ہے تو نے؟“

”رانی سنو ۱۹۴۲ء کی بہترین ایکٹرس ہے نا“ میں نے پوچھا۔
”جی ہاں، وہ۔۔۔ وہی۔۔۔ سالانہ تو کیا اہلنے..... وہ میری محبوبہ
ہے..... سمجھے؟..... ایس؟ میں نے اس کے لیے اپنے ماں باپ
کی گایاں کھائیں..... بہتی ٹرائیاں ٹریں رقبوں سے..... اپنا گھر بار
چھوڑ دیا..... یہ انگوٹھی شلے دیکھتے ہو، یہ قمیض کے ٹن، یہ کف ٹن۔
یہ سب سونے کے ہیں، شلے تو کیا جلنے... یہ سب اس نے دیے ہیں۔
..... تحفے.... مگر میں اس سے شادی نہیں کروں گا کیجی نہیں کروں گا۔
اس نے فیصد کن اندازہ میں کہا۔

”کیوں؟“

وہ مجھے چاہتی ہے۔ پر وہ مجھ سے بہت امیر ہے..... وہ چاہتی ہے۔

کہ عجب سے شادی کرے۔ پر میں مریاؤں گا، اس سے بیاہ نہیں کروں گا۔
 ہتھیں اس سے محبت نہیں یا۔ ایک بتا رہے پرچھا۔

”لیکن بھی بگھرائی دولت کیوں چھوڑتے ہو؟ دیکھو تمہارے پرچھا۔
 ایکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ”میں جو ہوں وہی رہوں گا۔ میں اُس سے
 محبت کرتا ہوں، لیکن اس کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں اُس کی محبت
 چاہتا ہوں۔ دولت نہیں! اٹھ!“ ایکٹر نے زور سے غالیچے پر ہات مار
 کر کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

غالیچہ کانپ اٹھا۔ اُس کا رنگ عجب سا ہو گیا۔

”اور شراب ڈے سحر امزائے!“ وہ اپنے خالی گلاس کو ٹیٹل مارتا تھا۔
 میں نے کہا۔ ”رانی، اسے ابھی آج ہی تو میں نے اخبار میں پڑھا ہے
 کہ رانی نے ایک امریکن سے شادی کر لی۔“

ایکٹر نے آہستہ سے شراب کا گلاس غالیچے پر لٹکا دیا۔ اُس کی
 انگلیاں کاسچ کی سطح پر سختی سے جم گئیں۔ کاسچ اس کی انگلیوں کو زخمی کرتا
 ہوا ریزہ ریزہ ہو گیا۔

وہ زبردستی جوتے کھلتے۔ کہنے لگا۔ ”یہ غلط ہے، بائبل غلط ہے!“

آرٹسٹ نے میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھا۔

ایکٹر کا چہرہ!..... وہ غالیچے پر دونوں کنسیاں ٹیکے میری طرف دیکھ رہا

تھا..... اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس کا چہرہ متا جا رہا تھا۔

مئی کے خرد و خال ابھر رہے تھے۔

”یہ غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔“ وہ پھر چیخا، پھر اک دم خاموش ہو گیا۔

دوسرا ایکٹر اُس کے گلاس میں شراب اُنٹیلنے لگا۔ وہ اب بھی خاموش تھا، لیکن پہلا

ایکٹر غالیچے سے لگ کر سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اُس نے غالیچے پر قے کر

دی.... مجھے غالیچے کا رنگ اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ سُرخ سے سپید زرد

جیسے یہ غالیچہ زہر زدگی کا کفن ہو۔

رانی! رانی! رانی!!

صبح میں نے غالیچہ دُعا لایا، اور صاف کروا کے پھر کمرے میں رکھا۔

کہ میری محبوبہ کمرے میں داخل ہوتی، یہ میری نئے شہر کی محبوبہ تھی، یہاں آکر

آرٹسٹ نے پھر عشق کر لیا تھا عشق کرنا کس قدر مشکل ہے لیکن جب عشق

مر جاتا ہے، اُس کے بعد عشق کرنا کس قدر آسان ہو جاتا ہے! ہے نا!

مردود بولتے کھیوں نہیں ہو، جواب دو! میری محبوبہ کے ہونٹ مڑے

تھے، رخسار بھی موٹے، جسم بھی موٹا، ہنسی بھی موٹی، عقل بھی موٹی، وہ عورت نہ تھی، اک دہرا تہرا غالیچہ تھی، آج اس نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنا ڈالی تھیں، اور ان میں چنبیلی کے پھول سجھائے تھے۔
وہ غالیچے پر اگر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کی بلائیں لے کر کہا: ”آج تو تم قلو پٹرو کو بھی مات کرتی ہو۔“
”دکھو پترا کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”مصر کی ملکہ تھی۔“

”میسرہ۔“

”ہاں مصر! وہ ملک جہاں مرنے کے بعد ابرام تیار ہوتے ہیں۔ اور مردوں کی میاں تیار کی جاتی ہیں۔۔۔۔۔ خدا کرے تمہاری موت بھی قلو پٹرو کی طرح ہو!“

”ماتے کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا ہوا تھا اسے۔۔۔۔۔!“

”سانپ سے ڈسوا کر مر گئی تھی!“

وہ اک ہلکی سی چیخ مار کر میرے قریب آگئی: ”ڈراتے ہو مجھے؟“ اس نے
میرا بازو پکڑ کر کہا۔ پھر وہ ہنسی، اپنی موٹی جلدی ہنسی، جیسے بھینس جگالی کر

رہی ہو..... پھر اُس نے اپنے ہونٹ میرے آگے بڑھا دیے، جیسے کوئی
فیاض جاٹ کسی اجنبی شہری کو گنا چھنے کو دے دے!

میں نے گنا چوتے چوتے کہا: ”یہ غالیچہ جیتا ایک بار ہے لیکن مرنا
بار بار ہے.... کہ.... یہ موت بار بار کیوں آتی ہے.... اب ابھی جائے
آخری موت!“

”آج یہ تم کیوں بار بار موت کا ذکر کر رہے ہو؟ وہ منمناتی۔
”کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی“ میں نے کہا: ”ہاں یہ تو بتاؤ آج تمہارے
تازہ لبوں سے، رخساروں سے، آنکھوں سے، بالوں سے کیا یہ کیسی
لطیف خوشبو نکل رہی ہے؟“

”کچھ نہیں!“ وہ ہنس کر بولی: ”آج کھونٹے سے کا خوشبو ڈار تیل لگایا ہے!“
میں نے غالیچے کی طرف آنکھوں سے دیکھا، اس کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا
بے چارہ ایک بار پھر مر رہا تھا، اُس کی جانتی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی میں
گھبرا کر کرے سے باہر نکل گیا۔

سید عاشق شیش پہنچ گیا، ارادہ تھا، جی بھر کر بریہیں لگا، نہ صرف
اپنے گردن کو بلکہ اپنی رُخ کو بھی جلابِ دل لگاتا کہ یہ سارا کوڑا کرکٹ۔

غالیچہ

برجائے بیکل جائے طبیعت بیکل ہو جائے۔

ٹیشن پر تیرے پہلے روپ مل گئی۔

”اے؟ تم کہاں؟“

”جو ناگڑھ گئی تھی پہاڑ پر۔“

”اور شاعر؟“

”وہ کانس کرکھنے لگی، اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔“

”چھوڑ دیا ہے کیوں!“

”مجھے تپ دق ہے، جو ناگڑھ سین ٹوریم میں گئی تھی نا!“

اس کی نگاہوں میں ہنر رنگ کا سمندر تھا۔ اور اک زرد ڈونخیف چہرہ

بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔ پھر وہ چہرہ بھی غائب ہو گیا، اب شاعر کا سٹرا

بُسا اُبشرو لہروں میں تھمنے لگا، شاعر کا چہرہ سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ”ہوں۔“

میں نے کہا، ”کہاں ہے وہ حوا ازاو!“

”جھانے دو۔ وہ محزول انداز میں کہنے لگی۔ اُسے گالی نہ دو۔۔۔۔۔ مجھے

”اُس سے ابھی تک محبت ہے!“

”لیکن۔“

”ہاں“ وہ بولی۔ اس لیکن کے بعد بھی۔ اب میں اپنے گھر جا رہی ہوں، میکے، آرام سے مروں گی۔“

”نہیں، نہیں۔ میں نے سختی سے کہا۔ اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ زندگی نے تمہیں مجھ سے چھین لیا، اب موت کے دھڑائے تکسم دونوں اکٹھے چلیں گے، اور اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا ہے تو شاید؟۔“ وہ ہنسی، وہی اچھالی ہنسی، وہی صندلی چہرہ، وہی دکھائی دینا، تم۔ میں نے اُس کی بات نہ کر کر کہا۔ گھر چلو۔ روپ اب جیتے جی تم نے مجھے اپنے ساتھ نہ لے نہ دیا۔ اب موت کے چند لمحے تو بخش دو۔“

وہ مسکرائی۔ بولی۔ ”تم نہیں جانتے؟ محبت زندگی میں اور موت میں بھی یکساں سلوک کرتی ہے!“ گاڑی نے سیٹی دی۔

وہ بولی ”مجھے امید نہ تھی تم کبھی ملو گے“ افسوس ہے کہ میں یہاں تک نہیں سکتی، ہاں یہ کتاب تمہیں دے سکتی ہوں، لکے کی نقلیں۔“ گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔

وہ اپنے ڈبے کی طرف چل دی، میں اُس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ

سکا۔ میری آنکھیں پھر اس کے پاؤں پر گر گئیں، وہ پاؤں چلتے گئے، چلتے گئے۔

دور جاتے ہوئے بھی گویا قریب آتے گئے، بالکل میرے سینے پر آ گئے،
اور میں نے انہیں اٹھا کر اپنے سینے کے اندر چھپا لیا.....
میں نے نگاہ اٹھائی۔
گاڑی جھپکی نہ تھی۔

محبوبہ ابھی تک میری راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی: "کہاں چلے گئے تھے؟"
میں چپ ہو رہا۔
"یہ کونسی کتاب ہے؟"
"الکے کی؟"
"کیا؟"

"ایک شاعر کی نظمیں ہیں۔"
"مجھے سناؤ۔ کیا کہتا ہے یہ؟"
میں نے کتاب کھولی، ہندو حواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا۔ بہت

سے پڑھنا شروع کیا۔ اُسے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔ اب موت تیری مرضی کے مطابق بخش دے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوند!“

”پھر موت!“ وہ بولی۔ ”برائے گن ہے۔ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے پھینک کر انگ کر دی، اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیے۔ غالیچہ اُبل اُٹھا، بالکل آگ تھا شعلوں کا دریا پیپ کا سمندر زہر کا کھولتا ہوا گرم پتھر میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تم صلیب ہو، تم نے آدمی کے بیٹے کو مسیحا بنا دیا۔ بتاؤ مجھے کیا بناؤ گے؟“

غالیچہ نے کہا۔ ”جو تم خود ہی چکے ہو، اک اہرام۔“

جس کے سینے میں میاں دفن ہیں۔“

میں نے اپنی غم جو برے کہا۔ ”میرا جی چاہتا ہے۔ اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں اپنا تو ہو گیا ہے۔“

”لیکن میں نے رک کر افسرہ لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس تو یہی

ایک غالیچہ ہے۔ اور یہی ایک زندگی ہے۔ نہ اسے بدل سکتا ہوں نہ اسے۔۔۔۔۔!“

یہ کہہ کر آرٹسٹ گنا چونسے لگا۔

ایک اسٹراٹجی کی

یہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کا واقعہ ہے میں کاناگا کرپنے دفتر کی میز پر سرٹیکے اونگھ رہا تھا کہ کمرے میں ایک اسٹراٹجی داخل ہوئی۔ یوں تو ایک ہیروئن اور ایک اسٹراٹجی میں وجہ تفریق کی بہت سی باتیں ہیں، لیکن ایک موٹی سی بات جو مجھے ایسے کندوہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ہیروئن اس طرح مجھے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جب ہیروئن یا کوئی اہم کردار ادا کرنے والی مثلاً کمرے میں داخل ہوتی ہے کسی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ تو اس کمرے میں تین چار آدمی اس کی پیشوائی کے لیے ضرور موجود رہتے ہیں، اس کی آمد کی خبر پہلے سے کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی کندوہن کا تماش

ایک کسٹرائٹ

کامریز پر اٹھتا ہوا نظر آجائے تو اسے شوکے دے کر پہلے ہی سے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ ہوشیار باش، مثلاً آرہی ہے۔ اور چونکہ اس دوپہر کو اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اس لیے یقیناً وہ لڑکی جو گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میسے کمرے میں داخل ہوئی اکسٹرائٹ کی تھی۔

اس لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ وہ منہس کر مجھ سے کہنے لگی کہ گھر والے اسے ”زبید“ ”زب“ کہہ کر پکارتے ہیں میں نے یہ کہہ کر نال دیا کہ اس طرح کہنا کچھ گھروالوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ بہر حال ”زب“ نام کی ایک اور لڑکی کو بھی میں جانتا ہوں۔ لیکن اس کی کہانی پھر کبھی لکھوں گا۔ کیونکہ اس کے ڈرائے میں حرف سوالیہ بھی آیا ہے۔ اور اس زبید کے افسانے میں حرف سوالیہ اگر گزر گیا ہے، یہ حرف سوالیہ بھی زندگی میں کمی ڈھنگ سے آتا ہے، کبھی تو یہ محبوب کے بوسے کی طرح شدید آگیں ہوتا ہے اور کبھی ناکام تنہاؤں کی طرح تلخ، کبھی اس کی تشکیل سرخ انگاروں کے ہوتی ہے، اور کبھی آنسوؤں کے نیلین پانی سے، لیکن ہر زندگی میں ایک بار تو یہ حرف سوالیہ ضرور آتا ہے، یہ بڑا دلچسپ مسئلہ ہوتا ہے، زیب یعنی وہ زیب نہیں جس کی کہانی میں اب لکھ رہا ہوں، بلکہ وہ زیب جس

ایک اکسٹرا لڑکی

کی کہانی میں پھر کبھی ٹکسوں گا۔ ابھی اس مرحلے میں سے گزر رہی ہے اور میں بحیثیت ایک تماشائی کے سے کسی قسم کا مشورہ نہیں دینا چاہتا۔ اس سے صرف توقع کرتا ہوں کہ اگر کبھی یہ سطور اس کی نظر سے گزریں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جائے۔ اور اگر نہ مسکرائے تو اور بھی بہتر ہو گا۔

زبیدہ نوکری کی تلاش میں آئی تھی، اور سٹوڈنٹ کے مالک نے غالباً مجھے سب سے بے ضرر اور مرخانی مریخ آدمی سمجھ کر اس کام پر تعینات کیا تھا۔ کہ میں اکسٹر امدادوں اور اکسٹر امدادوں کی شکل و صورت اور ان کی اداکاری کے امکانات کا صحیح جائزہ لوں، یہ اندازہ اس نے میرے گہنے سر دہیز جینک، اور اس بے اعتنائی سے لگایا تھا جس کا مظاہرہ میں اکثر صنعت باز کے سامنے کیا کرتا ہوں۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ تو محض اک وافعی حربے بے وز میری جلد کے نیچے بھی وہی تیز لہر دوڑتا ہے۔ اور احساسات کے ہیرو لاءوں میں وہی جنسی آگ شعلہ زن ہے اور ٹھنڈی، یخ، بریلی ٹکابوں کی بدلیروں میں بجلیوں کے کوندے مستور ہیں، شاید وہ سب کچھ سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس قدر کمزور ہوں کہ اپنی جھڑی شرافت کے خول کو توڑنے کی سکت بھی مجھ میں نہیں۔ اس لیے میں درحقیقت بے ضرر

ایک اکثر ادا

ہوں۔ یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ ہے اور داستان بیان کرتے وقت کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تکلیف دہ ہونے کے بجائے یہ میرے لیے اکثر دیر سرت بن جاتی ہے اور میں اس جھوٹی مشرافت کے سر جھٹنے سے اپنے لیے کئی بار احساس برتری مستعار لے لیا کرتا ہوں تم نہیں سمجھو گے۔ لیکن وہ زیب — میرا مطلب ہے وہ زیب ضرور سمجھ جائے گی جس کے لیے میں یہ کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔

ہاں تو زبیدہ اُس دوپہر کو میرے کمرے میں ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہوئی۔ زبیدہ چھٹی لڑکی تھی جس سے اُس روز مجھے انٹرویو کرنا پڑا۔ سب سے پہلے ہر لڑکی کو اتنی تھی وہ اپنے دو بھائی بھی ساتھ لائی تھی ایک کا نام بے بی گنگرے تھا، اور دوسرے کا نام جانی لاپٹو، وہ گجراتی لڑکی تھی۔ پرانی کمان کی طرح ڈھیلی ڈھالی، ناک نقشہ، چال ڈھال، بات سنجیت میں ایک غیر معین ناہمواری ہے، دلی، بے سلیکھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ نور ابھی ابھی گنی مٹی سے بنائی گئی ہے، اور اس کے فوراً بعد ہی میرے کمرے میں انٹرویو کے لیے وحکیل دی گئی ہے، میں نے اُسے ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔

ایک اکسٹرا لڑکی

تھی چل بھی نہ سکتی تھی اچھی طرح سے۔ جلتے ہوئے چمکٹ سے ٹکرا گئی۔
پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔ کون کتا ہے غائب ہو گئی۔ ابھی تک میرا
نگاہوں میں محفوظ ہے۔ اس کمرے کی میز پر اس فرش پر اس چوکھٹ پر
اس وردانے کے شیشوں پر اس گیلی میٹی کے نشان ہیں۔ دیکھنے والا دیکھ
سکتا ہے۔

دوسری لڑکی بدھوار پیٹھ پڑنا سے آئی تھی۔ پودنا سے بیسی آئی تھی۔ نگاہی
نگاہ کی جارحیت کی ساڑھی اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی، اور اس کے اندر
سے اس کا جسم اک خشک تنے کی طرح نظر آ رہا تھا، اس کی نگاہیں ویران
تھیں، اس کے لب ویران تھے اور اس کا سینہ ویران تھا، وہ اک ٹٹے ہوئے
شخص کی طرح آکر مجھے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس طرح بیٹھ گئی گویا کہ
رہی ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے ملازمت نہیں دو گے۔ میں جانتی ہوں
مجھ میں رس، شعریت نہیں، نساہیت نہیں، پھر بھی میں تمہارے پاس
آئی ہوں۔ کیا اس بے حیائی، ڈھٹائی کوئی امید بر نہ آئی؟ کی بھی داد نہ
دو گے۔

میں نے دل میں کہا ”مطلق نہیں“ اور اس سے پوچھا ”تمہارا نام؟“

ایک اکثر اٹل

”کوشیا“

”تم بدھوار پیٹے پونا سے آئی ہو“

”ہاں ہو“

”ہاں ہو؟“ میں نے کہا: ”تم امرتسر کی رہنے والی معلوم ہوتی ہو؟“

”خوب پہچانتا ہوں۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔ اور اس کے سیاہی آئل

نزد دانت جڑوں میں اکھڑتی جڑوں کے سروں کی طرح دکھائی دینے لگے۔

”پہلے کسی تصویر میں کام کیا ہے؟“

”ہاں ہوا حکم دیکھتے تھے جادوگر باج بہادر، چٹ پٹ منگنی، میں

لگاتی بھی ہوں، بدھوار پیٹے میں اپنا کوٹھا ہے۔ کبھی آؤں؟“

میں نے پوچھا: ”تم امرتسر سے پونا کیسے آگئیں؟“

”رزق!“ اس نے آہستہ سے کہا۔ بے ڈلی سے کہا۔ بے سبب جان

بے نور ہے میں کہا۔ اُس کی نگاہوں میں، اُس کے جسم میں، اس کی روح میں

تاریکی ہی تاریکی تھی اور اسے دیکھ کر ایک کراہت آمیز نفرت کا احساس

میرے دل میں بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ شاید وہ عورت نہ تھی، تاریک گندے

گیسے بانی میں پیدا ہونے والی جو تک تھی جو میری میز پر دھری تھی۔ اور آہستہ آہستہ

ایک اکسٹرا لڑکی

میری طرف رنگ رہی تھی۔

”جاؤ، جاؤ....“ میں نے چلا کر کہا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا: ”در اصل بات یہ ہے کہ ابھی فلم کے شروع ہونے میں دو ماہ باقی ہیں۔ ہمیں یقیناً آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی اور ابھی بہت سی لڑکیاں....“

وہ میری بات کاٹ کر بولی، ”میری چھوٹی بہن کو مستی بھی مجھے ساتھ آئی ہے....“ اور گوستی ادھر آؤ

بڑی جونک، چھوٹی جونک! اُس سے چھوٹی جونک....

”ماں آپ کو اور آپ کی بہن کو بھی ضرور بلاؤں گا۔ فی الحال تو۔“

اچھا نھتے!“

”یہ میرے فوٹو ہیں۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے اپنی گلابی ساڑھی کا پتہ دے کر

کہتے ہوئے کہا: ”جورچہ ناکہ دی آؤ تو سہاڑے کوٹھے ضرور آنا۔“

وہ دونوں پہلی گیش، بڑی جونک چھوٹی جونک.....!

تیسری لڑکی: ”ابھی تنخواہ مرا لی! لڑکیوں کے بدن میں بالعموم ایک

دکھش تہاؤ ہوتا ہے اور انکھوں میں اک بے بس ہر فی کی سی غموریت ہوتی ہے۔ جسے

ایک اکثریت

مرد بالعموم بہت پسند کرتے ہیں، لیکن یہ لڑکی بے بس ضرور نظر آتی تھی،.....
..... لیکن ہر فی نہیں۔ لگا ہوں میں تناؤ ضرور تھا لیکن جسم
میں اس حقیقت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ عجیب بے ڈھنگی سی۔ لگتا بڑا
چمچ کی سی چال چلتی ہوئی اندرائی، اس کے ساتھ اس کا خاوند تھا۔ جو
کمرے میں داخل ہوتے ہی دانت نکال کر مسکراتے لگا۔ اور جب تک
کمرے میں رہا۔ اسی طرح مسکراتا رہا۔ خدا جانے یہ کمرے کی فضا کا اثر تھا
یا میری صورت کا۔ یا اُس خوش آئند تصویر کا جو اُس کی بھری کے منہ بن
جانے کی صورت میں اُس کے مستقبل کی ہوتی۔ شاید اُس کی مسکراہٹ
اُس حرف سوالیہ کا جواب تھی جو آج اس بد نصیب جوڑے کے مقدر میں لکھا
جا رہا تھا۔ اکثر اوقات آدمی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ حرف سوالیہ اُس کے
سامنے ہے اور اُس سے زندگی کا، اُس کی اہمیت کا، اُس کے تواتر کا،
اس کے بنیادی اخلاق کا جواب طلب کر رہا ہے، وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا
اور یونہی احمقانہ طریق پر مسکراتے جاتا ہے، یہ آدمی یہی کر رہا تھا۔ بیس سال
بعد جب یہ گنجا ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھوں پر دبیز عینک چڑھی ہوگی۔
میری طرح رٹے گا، مسکراتے دوا بھی اسے.....

ایک اسٹراڈلر کی

”یہ میرا بیوی ہے“ وہ مسکرا کر بولا ”ذکر ہی کرنے ہوتا“

”ہندی یا اردو جانتی ہے؟“

”ہو۔ بھارچا نگلا.... (بہت اچھا)

میں نے کہا ”اچھا تو لکھو.... اُسے میں اس لکھو ہی کے گھر کیوں...“

”نہیں.... نہیں۔ لکھنے کو نہیں مانگتا۔ میرا بیوی زبانی یاد کرتا۔ تم اس کو

بتانا یہ اکثر نے.... بھارچا نگلا“

میں نے کہا ”اچھا تو کمرہ شب چراغ“

”شب چراغ“

”شب چراغ نہیں۔ شب چراغ“

”شب چراغ“۔۔۔ یہ کہہ کر وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

میں نے پوچھا ”یہ ہنستی کیوں ہے؟“

وہ اپنی بیسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا ”ایہ.... ہمارے بولی

میں اس کو گالی بولتا۔ بڑا گالی“

”بھارچا نگلا!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ کہو.... ”شب چراغ“

”نہیں.... نہیں....“ وہ اب شراگئی۔ شراگتے وقت اتنی ہیرو تو

ایک اکسٹرا لک

اور احمق معلوم ہونے لگی وہ

”پہلے کسی تصویر میں کام کیا؟“ میں نے بات کاؤنچ پلٹتے ہوئے کہا۔

”ناہیں، ناہیں۔ ہمارا بیوی کدھر کام نہیں مانگتا۔ ام شریچہ لوگ اے“

اگڑے ٹکڑے ام بولا۔ اس کمپنی کا لوگ برسہا آجاء اس کو مشکل سے اچھی

کرتا۔ میرا بیوی بولتا۔ تم اگلے ساتھ ہوتا تو ہم کام کرتا ہوا ام بولا۔ پچا چا نکلا

ام جی تھامے سنگ کام کرتا۔ ام اس کے سنگ اتنی پریم کرتا۔

”پچا چا نکلا!“ میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”ستھارا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ آخر میں میں نے اس جوڑے سے

کہا۔ ۵ کا باویری لین۔ پورا نامندزیمبی؟“ میں نے کہا۔ بہت جلدی

تھیں بلانے کی کوشش کروں گا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا میں نے اپنا جواب ہلایا۔ وہ پھر بھی

مسکراتا رہا میں نے انھیں رخصت کرنے کے لیے بات بڑھایا۔ اس نے

بات جوڑ دیے اور مسکراتا رہا۔ اس کے کوٹ کا کاترین جگہ سے پھٹا ہوا تھا

اُس لڑکی کی دھوٹی گودھر کی ڈھلی ہوئی تھی۔ لیکن سخت بوسیدہ تھی۔ اٹھتے وقت

مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سچی مچ بے بس ہوتی

ایک اسٹراڈا کی

تھی۔ اُس کی نگاہیں زمین پر گڑ گئیں اور اس کا خاوند مسکراتا رہا۔ واپس
 چلتے بھوٹے، میری طرف دیکھتے بھوٹے برابر مسکراتا رہا۔ اور جب وہ میرے
 کمرے کے باہر چلا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہنسی نہ تھی، یہ رونا تھا۔ اُس
 کی شرافت بھی میری طرح جھوٹی تھی اور جگہ جگہ سے کھٹکتی ہوئی تھی۔ اور وہ
 اس میں تبسم کا پیوند لگا کر اپنی غربت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا
 تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف، اپنی بیوی کو نہ بچنے آیا تھا، اور مسکراتا تھا۔
 اور اُس کی مسکراہٹ میں انسانیت کا خون تھا، یہ باتیں میں اب تم سے بیا
 کر رہا ہوں۔ ورنہ اس وقت میں نے اُس سے صرف یہ کہا تھا میں تمہیں ضرور
 جاننے کی کوشش کروں گا، یہ جھوٹ ضرور تھا کیونکہ وہ دونوں خاوند بیوی
 کسی مزدور ستانی فلم میں کام کرنے کے لیے قطعی نامزدوں تھے۔ لیکن یہ ایک معمولی
 سا جھوٹ تھا۔ اتنا معمولی جتنا اس آدمی کا تبسم، ایک سیدھا سادا عام جھوٹ
 ایک جھوٹے آدمی نے دوسرے جھوٹے آدمی سے جھوٹ بولا۔ بس اور کیا۔
 پانچویں لڑکی نہ تھی، ادھیڑ عمر کی عورت تھی، تین بچوں کی ماں، دو لڑکیاں
 ایک لڑکا۔ بیوہ اور فریب اندام اور گلابی بھاری، خوش رنگ، آتے ہی پھسکڑا
 مار کر کسی پر بیٹھ گئی، پھر بیڑی نکال کر سگھانے لگی۔ بولی۔ کپنی نے کلبے کو

ایک کٹر لڑکی

”آٹھ دس دن کا کام ہے۔“

”باس؟“

”بس!“

”اچھا تو کروں گی۔ مگر بابا بپے کتنے دو گئے۔“

”بچھتر روپیہ ماہوار۔“

”باس؟“

”بس!“

”یہ تو بہت کم ہے بابا۔ میرے بچے ہیں۔ دولڑکیاں۔ ان کا بیاہ

مجھے کرنا ہے۔ کچھ تو سوچا اور۔“

لمحہ اترنے لگا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو بالکل ہی اُتر چکا تھا۔

چھٹی لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ جسے گھر والے زیب کہہ کر پکارتے تھے۔

خیر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، وہ کنواری تھی، کم از کم اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔

زبیدہ کا جسم جوان تھا، اُس کی آنکھیں جوان تھیں، اُس کے ہونٹ جوان

تھے، اس کی مسکراہٹ جوان تھی، اُس کا ماتھا گھٹا ہوا تھا، اس کی ناک میٹھی

ایک اکسٹرا لڑکی

ہوئی تھی، اس کا رنگ کالا تھا، وہ ایک ایسی لڑکی تھی، جو بد صورت ہوتے
 نمونے بھی بد صورت نہ تھی اور خوبصورت سمجھے جاتے ہوئے بھی خوبصورت نہ تھی،
 اس کے جسم کے خطوط میں، اور اس کے آبنگ میں، اور اس کے نغصے
 میں شمال اور جنوب کے قطبوں کی آمیزش تھی، آریائی خون در اوڑ جلد میں لہریں
 سے رہا تھا، اور در اوڑی جدت آریائی ہفت کو گھلا کر اسے ہانی کی طرح
 پگھلا رہی تھی، اس وجہ سے تو زبیدہ کے جسم کا اور اس کی روح کا
 صحیح تجزیہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اک مسلسل تجربہ تھی، جسے دونسیں،
 دو تہذیبیں، دو زمانے، ایک سلچے میں کھولا ہے تھے، اسی لیے تو وہ
 خوبصورت تھی نہ بد صورت، جوان تھی نہ بڑھیا، کالی تھی نہ گوری، آریائی تھی
 نہ در اوڑی، کبھی تو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن معلوم ہونے لگتی
 اور وہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی، دوسرے لمحے میں اس کی آنکھیں چھوٹی
 اور اس کا ماتھا گھٹا ہوا معلوم ہوتا۔ کبھی تو اس کی جلد میں آریائی
 اُجلا پن نظر آتا، دوسرے لمحے میں کالی ناگن کی سیاہ لطافت اس
 کی جلد میں نمود کر آتی، اور بیٹھی ہوئی ناک کے نیچے خوفناک پھنوں کی طرح
 پھڑکنے لگتی۔

ایک لکڑاڑکی

”زبیدہ۔ کہاں کی لہنے والی ہو“

”بھینچی کی“

”ہا ہا کیا کام کرتا ہے“

”ایک سوڑا واڑکی دکان ہے اس کی، اور میری ماں ایک پارسی

کے ہاں ملازم ہے“

”اور انھیں تمھارے — میرا مطلب ہے — اگر تم —

ظلم میں کام کر تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا“

”مطلق نہیں صاحب!“

”تم اردو بہت اچھا جانتی ہو“

”شکریہ، مجھے غزلوں کا بہت شوق ہے۔ میرا باپ بڑا عالم

فاضل ہے مجھے پاس مینا کی جگر آغاب، آغ سب کے دیوان موجود ہیں“

”جو شش کا کلام دیکھا ہے“

”نہیں“

”کرشن چندر کے افسانے پڑھے ہیں“

”نہیں، مجھے افسانے لکھ کر دیکھنی نہیں۔ مجھے بس غزلوں کا شوق ہے،

ایک اکثر اڑکی

داغ آکا۔ کیا کہتا ہے۔ اور جگر آواہ واہ

”تم لوگری کیوں کرنا چاہتی ہو؟“

”مجھے فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”فلم میں کام کرنا جان جو کموں کا کام ہے۔“

”واہ۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ میک آپ کیا اور کیرے کے سامنے

آگئے وہ اس میں کیا مشکل ہے۔“

”کبھی کام کیا ہے۔“

”نہیں۔ مگر شوق ہے مجھے غزلوں کا بڑا شوق ہے آٹھ لیں کتے میں؟“

”نہیں میں غزلیں نہیں کہتا۔ سننا ہوں۔ سناؤ گی؟“

”واہ۔ میں غزلیں کیوں سناؤں گی بھلا میں شعر تو نہیں کہتی؟ دوسروں

کے کہے ہوئے پڑھتی ہوں۔ مجھے تم کوئی پارٹ و دنا۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”جانی واگر۔“

”جانی واگر اچھی چھی چھی جانی واگر بڑا برا نام ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ یہ ایک شراب کا نام ہے۔ اچھے آدمی شراب نہیں

ایک اسٹراٹل

پیتے۔ مجھے جگر کی غزلیں بہت پسند ہیں۔

”جگر شراب نہیں پیتا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تھیں کیسے معلوم ہے؟“

”مجھے متاب نے بتایا تھا میں ایک روز متاب کے گئے تھے بھاری

اچھی طرح ملی چھانے پلائی، اتنی بڑی ایکٹرس ہے وہ، پر غور۔۔۔ چچی چچی

— نہ جانے بڑی بڑی فلم ایکٹرسوں کو غور دے کس بات کا ہوتا ہے۔ کیوں

جی؟ اور میں نے دیکھا رانی کو ٹیلی فون کیا اس نے جواب نہیں دیا۔ کیوں جی؟

یہ کیا بات ہے۔ واہ۔۔۔“

میں اس کی ساڑھی کی طرف دیکھنے لگا۔ دھوبی کے ہاں دھلی ہوئی

تھی۔ سفید وائل کی ساڑھی، جس پر طاؤسی نقش و نگار کا بارڈر تھا۔

میں نے کہا: ”بارڈر اچھا ہے۔“

وہ بولی: ”شکریہ۔۔۔۔۔“ مجھے معلوم ہے۔“

میں نے پوچھا: ”تھیں کیسے معلوم ہے۔ جگر نے بتایا تھا کہ متاب

نے کہ دیکھا رانی نے۔“

ایک اکثر اڑکی

وہ بولی ”چھی چھی چھی۔ ایسی باتیں کرتے تھے آپ کو شرم نہیں آتی؟ یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ مجھے ہات پر رکھ دیا۔ لائیے میں آپ کا ہات دکھیوں۔“
میں نے اپنا ہات اُس کے ہات میں ڈال دیا۔ دونوں ہاتھوں میں بہت سی باتیں ہوئیں، محبت کی باتیں، وصال کی باتیں، جسم کی لذت کی باتیں ہمیشہ زندہ اور جوان ہنس کی باتیں، سب جھوٹی باتیں، میں بھی سمجھتا تھا، وہ بھی سمجھتی تھی، ”خاکا کر کہنے لگی۔“ مجھے نوکری چاہیے۔“

میں نے کہا ”میں نے تمہارا پٹا نوٹ کر لیا ہے اور۔۔۔“
وہ بولی ”مجھے کلی تک جواب دو۔“

اس کے بعد وہ دوسرے دن آئی۔ تیسرے دن وہ آئی۔ چوتھے دن وہ آئی، پندرہویں دن وہ آئی۔ ہر بار اس کے ہات میں ایک نئی کتاب ہوتی، کسی پرانے شاعر کا کلام، مطبع نو کشور، لکھنؤ، پرانی کتابیں جن سے سونڈھی سونڈھی خوشبو آتی تھی، پرانے کاغذوں کی خوشبو، پرانے زمانوں کی پرانی جوانیوں کی، پرانے آنسوؤں کی خوشبو، اور ہر بار اُس کے بدن پر وہی سادھی، ہوتی، دھو بی کے ہات سے دھلی ہوئی اور وہی طاؤسی بارڈر، اور وہی غزلیں، بار بار پڑھ کر مجھے سنا آتی تھی وہ، اور ہر روز نوکری کے لیے التجا

ایک اکسٹرا لڑکی

کرتی۔ یونہی، باتوں باتوں میں سرسری طور پر، ایک دفعہ کہہ دیتی "اور پھر طے ان کے ورق اُلٹ کر مجھے سنانے لگتی، جیسے نوکری سے زیادہ ان شاعروں کے عشق ہے۔"

ایک دن میں نے کہنی کے مالک سے کہا: ایک اکسٹرا لڑکی آتی ہے نام ہے زبیدہ، تلفظ اچھا ہے۔ گرناک میں بولتی ہے، مگر چل جائے گی۔
"شکل و صورت کیسی ہے۔"

"بس یونہی جیسے اکسٹرا لڑکیوں کی ہوتی ہے، مگر ذہن معلوم ہوتی ہے اس کا باپ بڑا عالم فاضل ہے اس کی ماں اک پارس کے ادا ملازم ہے۔"
"کون ہے وہ؟"

میں نے کہا: "طوائف تو نہیں معلوم ہوتی۔ نیم طوائف شاید۔"

وہ ہلنے دو!

میرے انکار کرنے کے بعد بھی وہ آتی رہی کسی نے اُسے بتایا کہ سعید اسے لو کر آ سکتا ہے۔ وہ سعید کے پاس گئی، کسی نے اُسے بتایا کہ جمیل سے اس کا کام ہو سکتا ہے، وہ جمیل کے پاس گئی، کسی نے بتایا کہ لال اس کا کام کر دے گا، وہ لال کے پاس گئی۔ اور پھر پھر کر میرے پاس آئی۔ اب

ایک اکثر اڑکی

وہ ماسے سٹوڈیو میں بدنام ہو چکی تھی، کیونکہ وہ نوکر ہونا چاہتی تھی۔ اور اسے نوکر چاہل کرنے کا ڈسنگ نہ آتا تھا۔ وہ اس بے حیائی کے انداز میں کہہ رہی تھی مجھے ے لو — مجھے ے لو — کہ کوئی اُسے لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی تیوری چڑھالی۔ میں اس کی مسلسل آمد و رفت سے عاجز آچکا تھا۔ اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”زیب!“

”جی!“

”تم گھر جاؤ اور یہاں کبھی نہ آؤ۔“

”بہت اچھا۔“

”جب تمہاری ضرورت ہوگی تمہیں بلا لیا جائے گا۔“

”بہت اچھا۔“

”زیب!“

”جی!“

”حقاً اس طرح خوشامد کرنا مجھے“

میرا فقرہ ناتمام رہ گیا۔ کیونکہ وہ رو رہی تھی۔

ایک اکڑ اڑکی

وہ روتی رہی اور میں میز پر بیٹھا ہوا اپنی انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا۔

جب وہ چپ ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگی: ”یہ شعر آپ کو پسند ہے۔“

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی

کیوں تیسرا رنگذر یاد آیا؟

میں نے کہا: ”غالب کا شعر ہے!“

وہ بولی: ”اور مجھے یہ شعر بھی بہت پسند ہے۔“

ہم نے بھی وضع غم بدل ڈالی

جب سے وہ طرز التفات گئی

میں نے کہا: ”جگر کا شعر ہے“

وہ بولی: ”میں جانتی ہوں۔ خدا حافظ“

”خدا حافظ!“

زبیدہ چلی گئی۔ اس نے اپنی وضع غم بدل ڈالی، اب وہ ایک فلمی

دلال بادامی کے پاس ہے، بادامی اسے ایک بہترین فلم ایکٹرس بننے کے

سارے لوازم ہم پہنچا رہا ہے، اب تک تین چار ڈکیروں کو فلمی ستارے بنا چکا

ایک اسٹراٹگی

بادامی ہر سال ایک لاکھ روپے انکم ٹیکس ادا کرتا ہے، اس کام ہے نئی لڑکیوں کو فلم ایکٹرس بنانا اور پھر انہیں بچنا۔ وہ کتا ہے یہ بڑی اچھی تجارت ہے، ملک میں یہ تجارت اب پانچویں نمبر پر ہے، بادامی نے زمبیدہ کو زندگی کے نازک ترین مرحلے سے بخیر و عافیت گزر جانے کا موقع دیا۔ وہ اس کے لیے سکر گزار ہے، اس سال زمبیدہ بادامی کے ساتھ سندھ اور پنجاب میں ایک ناچ پارٹی میں دوے پر جا رہی ہے پچھلے سال بادامی نے اسی دوے میں تین لاکھ روپے کما لیے تھے۔ اب زمبیدہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے۔

زंबیدہ گئے سال فلم سٹار بن جائے گی۔ پھر وہ اپنی آمدنی کا تیس فیصد بادامی کی مندر کیا کرے گی کالج کے لڑکے اس کے گھٹے ہوئے ہاتھ دیکھیں ہوں نا، اور گنگنے انداز تکلم پر قربان ہوا کریں گے، اور اس کی تصویریں اپنے البم میں سجائیں گے اور چاندنی راتوں میں آہیں بھریں گے۔ اور جس کمپنی کے مالک نے اسے اپنے ہاں پچتر روپے کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تھا وہ اب اسے دس ہزار روپے دے کر اپنی نئی تصویریں کام کرنے کی دعوت دے گا۔

اور اخباروں میں زمبیدہ کی تصویریں چھپیں گی، اور لوگ اسے گالیاں دیں گے اور لوگ اسے بیوقوفائی، بے حیائی، سنگدلی، انسانیت کے حوصلہ افزا خطابات سے

ایک اسٹرا لٹکی

نرانہیں گے۔

یہ سب کچھ ہوگا اور بہت کچھ ہوگا اور خوب ہوگا، اور مجھے اس لیے ہوگا کہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا اور ایک ظوائف کو جنم دیا گیا تھا۔ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے سوچ کو ڈوب جانے دیا تھا اور تاریکی کو بچا لیا تھا، گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میرے اور تمہارے سامنے ایک حرفِ سوالیہ آیا تھا۔ او اس کے جواب میں میں نے اور تم نے چھ لڑکیوں کے چہروں پر کچھڑ پھوٹ دی تھی۔

کیونکہ زبیدہ ایک لڑکی نہ تھی، وہ چھ لڑکیاں تھیں، چھ نہیں بلکہ سات، کیونکہ ان باتوں میں وہ زبیدہ یعنی وہ زبیب بھی شامل ہے جس کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔

پچانسی کے سائے میں

زندگی کے آخری لمحے کیوں بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ محض جینا ہی کافی ہے۔ محض جینا ہی خوبصورتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے فیروز ڈاکو کے آخری لمحے یاد آتے ہیں۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا، اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوست کے ہاں رام گڑھ جاتا تھا۔ تھوڑا کلاس کے ڈبے میں بہت بھیڑ تھی، بڑی شکل سے مجھے کھڑے ہونے کی جگہ ملی، لمبا سفر تھا کچھ گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے، مجھے قریب کی سچ پر دو ننھی ننھی دھکیاں میٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا بھائی جس کی عمر بے شکل آٹھ نو سال کی ہوئی ان سے پرے ان کی ماں میٹھی تھی، اس سے پرے پیر دوڑ کے بیٹھے تھے

ان کے کپڑے صاف تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی ٹلی کی ٹوپیاں، ان کے ساتھ ان کی ماں بیٹھی تھی، ادھیڑ عمر کی لالائیں، جس نے ایک پیلے رنگ کی ریشمی دھرتی پہن رکھی تھی۔ اس کا گول چہرہ متین اور غمگین نظر آتا تھا۔ دونوں لڑکے سمٹ کر الگ بیٹھے تھے، اور کبھی کبھی ان دو ننھی ننھی لڑکیوں کی ماں کو دیکھ لیتے، اُن کے چہروں پر غم و غصہ اور خوف کے جذبات ہرید ہوجاتے اور پھر وہ اپنا چہرہ پرے کر لیتے اور اپنی ماں کا آچھل پکھلے لیتے ننھی لڑکیوں کی ماں کا چہرہ فٹ تھا۔ اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے، ادا وہ انہیں کالے رنگ کے کھدر کے ڈپٹے سے پونچھ لیتی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی، اس کا لڑکا اپنی ننھی بہنوں کو میٹھے نمسواؤ اور کھٹے کچالے اور گنڈیریاں راستے کے مختلف اسٹیشنوں سے خرید کر کھلاتا تھا اور لالائیں کے لڑکے اُسے گھور کر دیکھتے اور پھر اپنی ماں سے کسی حمیہ کی فرمائش کرتے اور پھر لالائیں آہستہ سے جھپک کر سیدٹ کے نیچے سے ایک ٹوکری کا ڈھکنا الگ کر کے سیدٹ سنگترے یا کیلے نکال کر اپنے بیٹوں کو دیتی اور وہ اک ناکھانہ انداز سے ان دو لڑکیوں کے بھائی کی طرف دیکھتے اور منے سے پھل کھانے میں اور اسے دکھانے لگتا تھا کہ میں

معروف ہو جاتے۔

ابھی رام گڑھ بہت دور تھا۔ اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے قریب کی بیچ پر بیٹھی ہوئی ننھی لڑکی سے التفات ظاہر کیا۔ اُسے ایک دوا سٹیشنوں سے کھانے کے لیے چیزیں ہیں خرید کر پیش کیں بڑی پیاری ننھی سی لڑکی تھی۔ وہ بہت جلد میری گود میں آگئی اور میں آرام سے اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میری ناک سے کھیلنے ہوئے کہا: ”تم کہہ جا رہے ہو!“
میں نے کہا: ”میں رام گڑھ جا رہا ہوں۔“

ننھی نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا: ”اماں! یہ ام گڑھ جا رہا ہے۔“
ننھی کی ماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب بیٹھی ہوئی لالائی اور اس کے دونوں لڑکوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پھر کسی نے مجھ میں دلچسپی لینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف میری گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہی مجھے حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور خوشی، میں اس کا ساتھ تھا۔ ہم دونوں رام گڑھ جا رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا: ”تھائے ابا کا کیا نام ہے؟“

پھانسی کے سامنے میں

وہ بولی ”فیروز!“

میں۔ ”نہ پوچھا۔“ تھارے ابا رام گڑھ میں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں میرے ابا ویل میں ہیں۔“

”ویل میں؟“ میں نے پھر پوچھا۔ اس کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی،

اب دو چار اور لوگ بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

”ہاں۔ رام گڑھ ویل میں؛ کل اُن کو پھانسی ہوگی!“ لڑکی نے۔

نہایت اطمینان سے گنڈیری جوتے سمٹے جواب دیا۔

”جیل؟ پھانسی؟“

یکایک جیسے سارے ڈبے میں سناٹا چھا گیا میں نے لڑکی کی اماں

کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنا چہرہ اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا تھا

اور سسکیاں نے رہی تھی، اس ڈبے کی خاموشی میں وہی سسکیاں بھیلی

جا رہی تھیں۔ لالائٹن نے اپنے دونوں بچوں کو اپنی چھاتی سے چٹا لیا۔

سب لوگ خوفزدہ سے ہو گئے تھے، جیسے اس چلتی گاڑی میں کسی نے

پھانسی کا تختہ اُن کے سامنے کھڑا کر دیا تھا اور اپنی گردن اسی دسی

میں دیکھ رہے تھے۔

پھانسی کے سائے میں

”اماں۔ اباکی پھانسی ہو گی نا! لڑکی نے بڑے چاٹو سے اپنی اماں سے پوچھا۔
 اماں نے فوراً اُسے میری گود سے چھین لیا اور زور سے ایک ٹھانڈی سیڑ
 کیا اور پھر اسے اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا۔ لڑکی بہت دیر تک اس کالے
 دوپٹے میں دتی رہی، لالاشن اور اس کے بیٹے پر سے سرک گئے، فریض پر
 دو کسان بیٹھے تھے وہ بھی رام رام کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دور
 ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا کھڑے ہوئے، اس عورت اور اس کی
 دو لڑکیوں اور اس کے لڑکے کے ارد گرد گاڑی کے مسافروں نے
 ایک نظر نہ آنے والی چار دیواری کھڑی کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی باتوں
 میں مشغول ہو گئے۔ صرف اُس چار دیواری کے اندر فیروز اور اس کی بہن
 اور اس کے بچے اکیلے رہ گئے تھے۔ اور ایک اجنبی ایک طرف دروازے
 کی دہلیز پر کھڑا تھا اور گاڑی چل رہی تھی۔

اس رات رام گڑھ سے دس میل باہر بڑے دوست نے ایک عورت
 کا انتظام کیا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ لیکن چاند آدھے سے بھی کم تھا۔ اس لیے
 چاندنی میں سیاہی اور سیاہی میں چاندنی گھسی ہوئی تھی، ایسی رات عجیب سا سرسرا
 ہوتی ہے، زندگی کسی نامعلوم راستے پر دوڑنا چاہتی ہے اور اپنے عزیز ترین

پھانسی کے ساتھ ہیں

دوستوں کے چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں، اس محفلِ رقص و سرود میں مجمع بھی عجب تھا۔ عورتیں بھی اس دلیس کی معلوم نہ ہوتی تھیں، یہ سنسی بھی فطری نہ تھی، نچانے غم کا ہلکا سا غبار مجھے فضا میں پیرتا ہوا کیوں معلوم ہوتا تھا۔

میرے دوست نے پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو؟“

”تھکا ہوا ہوں شاید؟“

”اس لڑکی کا رقص تمہیں پسند نہیں؟“

”مجھے خیند آرہی ہے۔“

میرا خیال ہے، میں وہیں اُسی گاؤں کے سارے سارا لگائے ہو گیا۔

سوتے وقت صرف اتنا یاد ہے کہ زبان پر شراب کا ہلکا میٹھا ہلکا تلخ ذائقہ باقی تھا۔ لڑکی نکل رہی تھی۔ گھنگھروں کی صدا میں اس کی جوان آواز بگچھل بگچھل کر کہہ رہی تھی۔

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا

میرے دوست نے مجھے تھنجوڑ کر جگایا۔ موڑ بجا گئی جا رہی تھی غلابا

محفلِ رقص و سرود ختم ہو چکی تھی، اور ہم واپس ام گڑھ جا رہے تھے۔ فضا میں ایک اُجلا پن آرہا تھا اور بہت سے تاروں کے رنگ ماند پڑ گئے

پھانسی کے سائے میں

تھے، لیکن دو ایک تاروں کے رنگ نکھر رہے تھے، ایک ایک تارہ بہت سی روشنی اور حسین نظر آنے لگا۔ دور کہیں مرغ برالا۔ اور پھر گھڑیا نے پانچ بجائے۔

میرے دوست نے کہا: ”مجھے کیا معلوم تھا تم اتنے تھکے مانگے رام گڑھ پہنچ گے، میں نے یہ دھوت تمہاری خاطر منعقد کی تھی اور تم — موتے رہے!“

میں نے جانتے سے کر کہا: ”بھئی معاف کرنا۔ میرے پاس پیسے بالکل نہیں تھے۔ کجنت کبھی نہیں ہوتے۔ تھرو میں آیا۔ اب تم ہی بتاؤ۔۔۔۔۔“

”تھرو میں؟ لا حول ولا یجی ریس اندھا دھند نہ کھیلا کرو!“

”کون چند ریس کھیلتا ہے؟“ وہ قریلوں سمجھ کر کہ — اچھا تو یہ بتاؤ

کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”جیل جانے میں!“

”جیل خانے میں؟“

وہاں۔ تمہیں ایک عجیب تماشہ دکھلائیں گے۔ کبھی پھانسی

دیکھی ہے تم نے؟“

پھانسی کے سائے میں

ٹن !

گھڑیال کی آخری گونج میرے خون کی مدھم مدھم روانی میں ٹپ ٹپ اور پھر اس نے میرے خون کے ذرے ذرے کو چمکا دیا، ٹن ٹن ٹن، میرے خون کا ہر ذرہ اس صدا سے گونجنے لگا، اور روانی بڑھتی گئی، اور مجھے اپنا گلا گھستا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن خون خود بول رہا تھا۔ اس نے مجھے برسنے نہ دیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنا حلقوم سہلانے لگا۔

”شو فر تمہیں معلوم ہے۔ پھانسی کس وقت دی جائے گی۔“

”سائے پانچ بجے حضور۔“

”گاکڑی تیز چلاؤ۔“

سائے پانچ میں چند منٹ باقی تھے۔ جب ہم جیل خانے کے پھانک کے اندر داخل ہوئے اور کار کو گھما کر اس طرف لے گئے، جہاں پھانسی کھڑی تھی، یہاں جیل کے ملازمین اور ڈاکٹر، اور چند افسر لوگ جمع تھے، ایک چھوٹے سے میدان میں پھانسی کھڑی تھی۔ دو لمبے لمبے سیاہ کھجے ایک اندھے کنوئیں کے دونوں طرف کھٹے تھے، اور اس اندھے کنوئیں کے اوپر لکڑی کا ایک تختہ بچھا تھا، اس پر بھی سیاہ رنگ

پچانسی کے ساتھ ہیں

کیا ہوتا تھا، اور دونوں کھمبوں کے درمیان جو دو لوہے کے تار تھے ان کا رنگ بھی سیاہ تھا اور ان دونوں میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ دونوں تار ایک ڈیسے کے متوازی دونوں کھمبوں کے بیچ بیچ چلے جاتے تھے، میدان کے چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر کانچی کے تیز ٹکڑے لگے تھے اور ان سے پرے شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آتی تھیں۔ آسمان اب ابراؤد ہو گیا تھا۔

ہم بھی ڈاکٹر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، وزیر صاحب کے لڑکے کو دیکھ کر دو ایک افسروں نے ہمیں سلام کیا، چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے، قریب کی دیوار کا سایہ ایک سیاہ لہڑی کی طرح تماشائوں کے چہروں پر پھیلا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔ چند لوگ سگریٹ پی رہے تھے، سگریٹ کا دھواں اور گرم گرم سانس کا دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے آسمان پر روشن ستارے کو ڈھونڈا، جیسے بچہ خواب میں ڈر جانے پر اپنی ماں کی چھاتی ڈھونڈتا ہے، لیکن مطلع ابراؤد ہو چکا تھا اور اب تو ملکی ملکی بارش بھی شروع ہو گئی، کالی کالی دو چار چھتیاں کھل گئیں،

بھانسی کے سائے میں

لیکن بارش بالکل معمولی سی تھی، جیسے ہلکی ہلکی دوس گردہ ہی ہو۔ ستارہ کہیں نظر نہ آیا۔

میں نے نا اُمید ہو کر اپنے دوست سے کہا: ”چلو چلیں“
وہ بولا: ”بڑے بزدل ہو۔ یہ منظر تمہیں زندگی بھر اور کہیں دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔“

کہیں لوہے کا ایک پھانک کھلا، پھر سفید اُجلے کپڑے پہنے مجھے
ایک دیریا نے قد کا آدمی بھانسی کی طرف چلتا ہوا نظر آیا۔ اس کا سر منڈا ہوا
تھا اور چہرے پر چھدری سی واڑھی تھی۔ وہ بالکل ہمارے قریب سے
گزرا۔ اس کا چہرہ سپید اور سُستا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پیچھے پیچھے
بندھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب ایک لمحے کے لیے رُکا اور اپنے
پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر بھانسی کے کالے کھمبروں کی طرف اشارہ
کر کے بولا۔

”وہ آگئی۔ میری جان لینے والی۔“

اس کی سکراہٹ میں کسی مردنی تھی، اس کی آواز میں کسی تھر تھرا
تھی، جیسے اُس زندہ جلد میں ہوتی ہے، جسے چھری کی تیز دھار زخ کرنے

پھانسی کے سبائے میں

کے وقت چہرے، اس کی چال میں کسی اکٹڑی اکٹڑی سی جھجک تھی، جیسے وہ اپنی ٹانگوں سے نہیں لکڑی کی ٹانگوں سے چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بہادر آدمی تھا، دلیر آدمی تھا اور بغیر کسی سارے کے پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا اور خدا کا نام لینے لگا، بلند، صاف، یقین آمیز آواز میں....!

وہ کس طاقت کو بلارہا تھا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا: ”جدا دکھائی ہے؟“

جیسے میرے سوال کا جواب دینے کے لیے ایک آدمی ایک لمبا سفید کوٹ اور پتکوں اور سیاہ بُڑ پٹنے ہوئے لگے بڑھا۔ اور پھانسی کی طرف چلتا گیا، اس کے سر پر سفید گپڑی تھی، اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہو رہی تھا۔ وہ سیدھا دائیں بات کے کھجے کے قریب کھڑا ہو گیا، اور اس نے اپنا ہات لمبے کی پھر کی پر رکھ دیا۔ جس پر ریشمی ڈوری بندھی تھی اس کے دوسرے ہات میں ایک سفید کپڑے کا غلاف تھا۔

میرے دوست نے کہا: ”پرانی زمانے گئے، جکل تو جلا بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔“ پچھلے زمانے میں کسی قاتل کا خون معاف کر دیا جاتا تھا۔ اور وہ اس کے عوض میں سرکاری جلا دیا جاتا تھا۔ حقیقت

پھانسی کے سامنے ہیں

یہ ہے کہ اس قاتل کو اسی لیے معاف کیا جاتا تھا۔ اسی شرط پر کہ وہ گڑبگڑا
جلاؤ بن جائے۔

”اور اب؟“ میں نے پوچھا

”اب معاملہ دوسرا ہے، اب تو قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔

کہ محض جلاؤ بنانے کے لیے کسی کا خون معاف کر دیا جائے، اور عام طور پر
لوگ جلاؤ کے پیٹھے کو... میرا مطلب ہے، اچھا نہیں سمجھتے؟“

”وہ کیوں؟ ہم قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی قتل کرے اُسے

پھانسی کی سزا بھی دیتے ہیں۔ پھر جلاؤ کے پیٹھے میں کیا برائی دیکھتے ہیں۔ کیا
کہیں انسانی ضمیر کے اندر کوئی پھانسی رہ جاتی ہے؟“

”جلاؤ کے پیٹھے کے لیے ہمیں امیدوار نہیں ملتے، درآٹھا لیکر ریاست

میں اس کے لیے تنخواہ بھی اور گریڈ بھی، اور ترقی کا انتظام بھی خاطر خواہ موجود
ہے، پھر بھی... جلاؤ بننے کے لیے کوئی راضی نہیں ہوتا۔ اور اب تو جلاؤ

کا کام بھی اس قدر آسان ہو گیا ہے۔ بس چند لمحوں کی بات ہے...“

میرا دوست کہہ رہا تھا۔ اب فیروز کی پھانسی کے لیے بھی کوئی جلاؤ

نہیں ملتا تھا۔ بہتری کو شش کی۔ آخر یہ آدمی راضی ہوا۔ یہ اسی جیل میں

پھانسی کے سائے میں

کپڑے بند رہے، دو ایک مرتبہ خود بھی دشت ستانی کے جرم میں قید ہو چکا ہے
مریضوں کو سٹنٹن میں بڑی مہارت دکھاتا ہے اور زخموں کی چیر بھاڑ میں تو
اس کا مقابلہ اور کوئی کپڑے بند نہیں کر سکتا۔

یہ ایک فیروز نے پوچھا: ”میرے تار کا کوئی جواب آیا؟“
ڈاکٹر نے سر ہل کر کہا: ”مجھے افسوس ہے، فیروز، تمہارے تار کا کوئی
جواب نہیں آیا۔“

رحم کی آخری درخواست بھی ٹھکرا دی گئی تھی۔

”تم اپنے بیوی بچوں سے مل سکتے ہو۔“

یہ ایک لڑکے کا دروازہ پھر کھلا۔ اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں
دونوں کے ساتھ بچے تھے، دو ننھی لڑکیاں اور ایک لڑکا اور ایک کالا
دوپٹا اوڑھے ہوئی عورت، دوسری عورت کے ساتھ دو لڑکے تھے جنہوں
نے چھوٹی چھوٹی سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ دوپٹی ٹوپیاں۔
دائیں کھبے پر کالے دوپٹے والی عورت کھڑی ہو گئی، بائیں کھبے پر
وہ لالٹن اور اس کے لڑکے۔

”یہ کیا تماشہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

پھانسی کے سائے میں

میرے دوست نے جواب دیا: ”وہ لالائیں مقتول صاحب کی بیوی ہے
وہ اس کے دونوں لڑکے ہیں۔“

فیروز نے ہنس کر کہا: ”جھوٹے شاہ جی، اپنے باپکے قاتل کی پھانسی
دیکھنے آئے ہو۔“

میں نے کہا: ”یہ انتہائی ظلم ہے، ان لوگوں کو یہاں نہ آنے دینا چاہیے۔“
میرا دوست بولا: ”پہلے تو اس ریاست میں کیا ساری دنیا میں سڑاؤ
پھانسی دی جاتی تھی تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو۔“

”جھوٹے شاہ جی کا اب کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔“ فیروز نے تلوار کی دھار
کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

دائیں طرف اس کی بیوی اپنے بچوں کو ایسے کھڑی تھی۔ لیکن فیروز
نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ عورت اس کی طرف تکمی گئی، اور فیروز،
لالائیں اور اس کے بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔

یہ ایک ننھی لڑکی نے مات پھیلائے اور کہا: ”ابا!“

”ابا!“

”ابا!“

پہاڑی کے سامنے میں

فیروز نے ایک لمحے کے لیے شمال مشرق کی طرف مڑ کر دیکھا۔ لیکن
روشن ستارہ کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف بادل چھاٹے ہوئے تھے اور ہلکی
ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا: ”یہ انتہائی مظلم ہے۔ ان بچوں کو یہاں
آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔“

مڑکی نے کہا: ”آبا..... آبا..... آبا!!“

فیروز نے آہستہ سے جلا دے کہا: ”مجھے جلدی سے غلاف اٹھا
دو میں اپنی پجیروں کی صورت نہیں دیکھنا ہوتا۔“

میرے دوست نے جبل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا۔ اس نے
حکم دیا کہ اب دونوں عورتوں اور ان کے بچوں کو واناں سے پرے ہٹا
دیا جائے۔

لوہے کا پھانک ایک بار بھر کھلا اور لالائین اور اس کے دونوں
بیٹے باہر چلے گئے۔ فیروز کی بیوی ایک بارڑکی، مڑی اور چیخ مار کر اپنے
خاوند کی طرف بڑھنا چاہتی تھی، کہ پہرہ داروں نے اُس کے منہ پر بات
لکھ دیا اور اُسے لوہے کے پھانک کے باہر دھکیل کر دُور کہیں جبل خانے

پھانسی کے ساتھ میں

کے دوسری طرف لے گئے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے پانچ بجنے میں چارنٹ باقی تھے۔
”تم کچھ کمنا چاہتے ہو فیروزا ڈاکٹر نے پوچھا۔

”دعا کرو۔ میرے لیے دعا کرو۔ سب لوگ میرے لیے دعا کرو۔“

فیروز کی آواز اس خلاف کے اندر سے اس طرح آ رہی تھی، جیسے وہ کسی
تاریک اندھے کنوئیں میں بول رہا ہو۔“

جلاؤ نے ریشمی ڈوری کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور پھندے
کی گمانٹھ کو اس کے گلے میں فٹ کر دیا۔ انصاف کی رستی!

فیروز زور زور سے ادرتیزی سے اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔
وہ کس طاقت کو بلاتا تھا!

ایک منٹ گزر گیا۔

دوسرا منٹ گزر گیا۔

تیسرا منٹ گزر گیا۔

چوتھا منٹ گزرا۔ ٹین اچیل خانے کے گھڑیاں نے سبایا۔ گرنج
فضا میں تھرانے لگی۔

پہانسی کے سائے میں

ڈاکٹر نے سفید رومال بلایا اور دانتیں کھجے کی پھر کی ہلی، اور پہانسی کا تختہ بیچ میں سے شق ہو گیا، اور عین اُسی لمحے فیروز بہاری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا، وہ اب ان دونوں تختوں کے نیچے اندھیرے کمزئیں میں اُسی ریشمی ڈوسے سے لٹکا ہوا دم توڑا رہتا۔

صرف چند سیکنڈ کے لیے لاش تڑپتی، جس طرح بجلی کا تار جسم سے چھو جائے۔ ایک سیبانی اضطرابی حرکت، کرب اور بے چینی، اور مہیب اضطراب، جیسے لاکھوں ٹن پانی کا طوفان یکایک جہاز سے ٹکرا جائے جیسے رہتا ہوا لایا یکایک کسی آتش فشاں چوٹی سے پھٹ پڑے اور فضا میں آگ بنی آگ برساتے، جیسے خون کی ہر بوند میں اور دماغ کی ہر نس میں بارود کا فلیش یکایک بجک سے اُڑ جائے، نہیں، جب بھی نہیں، اس تڑپ، اس اضطراب، اس کرب کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے، جب روح اور جسم اس طرح زبردستی ایک دوسرے سے جدا کیے جاتے ہیں۔ وہ اضطراب، وہ حرکت وہ تڑپ، بجلی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح میری روح کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مٹنے دیکھا۔ اپنے ایمان کو خاکستر ہوتے دیکھا، اپنے تہذیب و تمدن کو خستہ خاں

پھانسی کے سامنے میں

کی طرح جلتے بجتے دکھیا، وہ انسان، وہ اس کا خدا، وہ اس کی تہذیب جس نے اس پھانسی کو روا رکھا ہے۔ جس نے خون کا بدلہ خون میں لینا چاہا ہے۔ کبھی پتہ نہیں سکتے، کبھی اٹھ نہیں سکتے۔ کبھی بلند نہیں ہو سکتے۔ فیروز کی صورت یاد نہیں۔ ہاں یاد کے ہر کونے میں پھانسی کا ایک تختہ دیکھتا ہوں، جس پر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس صورت دیکھتا ہوں اس کا چہرہ خلاف کے اندر ہے اور اس کے بازو نیچے بندھے ہوئے ہیں۔

یہ صورت جب بھی اکیلا ہوتا ہوں، میرے سامنے آتی ہے اور ایک خاموش طعنہ بن کر مجھ سے پوچھتی ہے مجھے جانتے ہو میں انسان ہوں۔ نیکی اور بدی کا پتلا، اذلی، ابدی انسان، تم نے مجھے اک ریشمی ڈوری سے اندھے کنوئیں میں لٹکا رکھا ہے، کیا مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔

بھوت

بارش ہو رہی تھی۔ گزشتہ پانچ روز سے متواتر موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ بادلوں کا رنگ دھواں دھواں تھا، اور زمین غل، پانی میں بھیگی ہوئی سبز تھل جس پر پاؤں پھسلتے تھے اور پانی کے پیلے بنسے اور پھٹتے تھے۔ فضا میں گرتی ہوتی بوندوں کا اندوہناک شور تھا اور ٹٹری ہوئی مٹی کی باس۔ مینڈک پانی کی وقتی جھیلیوں میں ٹراتے تھے۔ ایک بہت بڑا بھوسے رنگ کا مینڈک ان کے سامنے سے پھدکتا اور ریل کی پٹری کو پار کرتا ہوا آگے بھٹ گیا۔ سگنل والے کی کرٹھری کے پاس ایک بھینس چر رہی تھی، مینڈک اس کے پاؤں تلے آگیا۔ حادثہ اتفاق، خدا کسی کو کیا کہیے۔ زندگی مورت

میں مبتدل ہو چکی تھی۔

گاڑی آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اس نے ٹکٹ خریدا، چھاتا کھولا۔ چنے والے سے چنے کھائے، اخبار پڑھا۔ بوٹ پر پالش کرایا۔ سر کھجایا۔ اٹھ کر ٹیلا۔ ٹیل کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مصافحاتی اسٹیشن تھا۔ بمبئی سے انیس میل دور، اور یہ انیس میل۔ اس وقت ہزاروں میل معلوم ہو رہے تھے، پلیٹ فارم کی گھڑی کی سوئیاں گویا مدت سے ساکن تھیں۔ شاید یہ کینٹ بھی گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ اُس نے جھائی لی۔ ادھر ادھر دیکھا، کہیں کوئی خوبصورت عورت بھی تو نہ تھی۔ نگاہ کہیں نہیں رکتی۔ لوہے کے رنگ آلود تاروں پر کوئے ٹھہر رہے تھے۔ نم آلود پنچوں پر کائنات کی بد صورت تریں مخلوق میسٹی ہوئی پان کی جگالی کر رہی تھی، مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ وائیں سہلا رہی تھی۔ چنے کی خشک دال میں، کاندہ نمک اور سرخ مرچ اور شہر کارس ڈال کر اپنے دانتوں کی چکی تلے پیس رہی تھی اور بار بار آنکھیں جھپک کر ریل کی چمکتی ہوئی لائن دیکھتے میں مصروف تھی... گاڑی... کہیں کوئی گاڑی نہ تھی۔ ریل کی چمکتی ہوئی پٹری دور فضا میں گم ہو رہی تھی۔ اور پانی برس رہا تھا اور مینڈک ٹراٹے تھے۔

اگر وہ پانچ منٹ پہلے اٹھتا تو بھری دلی سے آنے والی گاڑی پر سوار ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب چھ بج چکے تھے۔ اور اُسے دوسری گاڑی کا انتظار تھا جو اپنے سات بجے آئے گی۔ اُس نے چھانا اُٹا کر اسٹیشن کے ایک کھجے سے لگا دیا اور قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا: "فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی عورتوں کے لیے"۔ اول تو اُسے پلیٹ فارم پر پہلے اور دوسرے درجہ کی ایک عورت بھی نظر نہ آئی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کے بچوں پر عورتیں اور عورتوں کے بچے پر مرد بیٹھے تھے۔ اس نے سوچا اس مرد میں بھی کس قدر رزم کا پہلو نمایاں ہے۔ لیکن کینجٹ اسٹیشن ماسٹر کو اپنی پتلون کی ٹوک پک درست کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ پلیٹ فارم کا اخلاق کیسے سمجھ سکتا ہے۔ چھاتے کی درازکانیوں سے پانی ٹپ ٹپ کر کے بہا تھا۔ اور فرش پر بہتا ہوا کچھ لکھتا جا رہا تھا ناگری کے حروف اردو کے حروف۔ گیدڑ کا منہ شیر کے ایال جناح کا چہرہ گاندھی کا جبرہ چرچل کا سگار۔ منہ کی ٹکونی چھت جو دیکھتے دیکھتے مسجد کے گنبد میں تبدیل ہوئی اور پھر گاتھک گر جو ان صورت میں نمودار ہوئی اور پھر ایک عالی شان محل کا کھنڈر بن گئی۔ قطرہ قطرہ کے پانی بہا تھا۔ اور ایک

ہی ظلم کی نرک سے مختلف زبانیں، تہذیبیں، شخصیتیں اور مذاہب ایجاد کرتا چلا جا رہا تھا۔ اب چھاتے کی ٹری ہوئی ہستی کے نیچے بہت سلاپانی جمع ہو کر ایک چھوٹی سی جھیل بن گیا۔ وہ منبع تھا تو یہ منزل ہے۔ اس نے سوچا جہاں سب تہذیبیں اور کلچر اور شخصیتیں گڈاڑ ہو جاتی ہیں۔ پانی بھی خوب چیز ہے صاحب! ہندو پانی، مسلم پانی اور پھر۔۔۔ چھاتے کا پانی! — گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔

ملاڈ سے چرچ گیٹ تک جانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہو گا۔ اس خیال سے اس کی کنپٹیاں ٹکٹے لگیں اور اسے اسپرو کے پکیٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ملاڈ تو ایک فیل منصفاتی آئیشن تھا، یہاں اسپرو تو کیا جھجھر کی بوتل بھی ہتھیانہ ہو سکتی تھی۔ جھجھر کی بوتل سے اس کے سر کا درد کیسے دور ہوتا لیکن وہ جھجھر کی بوتل ضرور پینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ملاڈ آئیشن سے فوراً رخصت ہو جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کی فضا میں برستی ہوئی بارش کی آوازیں تھیں اور مینڈک ٹراپے تھے اور غلیظ کوڑے رنگ آلود تاروں پر بیٹھے ہوئے اپنے ناپاک جسموں کو اپنی کالی چونچوں سے صاف کر رہے تھے اور گندے امیر و کبیر مارواڑی دھرتیوں سے جڑیں پھنسنے میں مصروف

تھے۔ اور ٹیال ٹیالی عورتوں نے ایک ہی قسم کے پھول ایک ہی طرح پر اپنے
 جوڑوں میں لگا رکھے تھے اور سیدھی مانگ نکال کر اپنے بالوں میں کھوپرے
 کا تیل لگا کر انھیں پالش کیے ہوئے بوٹ کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ اور وہ سیدھی
 مانگ دود سے بالکل بیل کی پٹری مسوم ہو رہی تھی۔ اور گاڑی ابھی تک نہ
 آئی تھی۔ عورت اور بیل کی پٹری میں کیا فرق ہے۔ اس نے سوچا بیل
 کی پٹری کسی اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے۔ عورت صرف ایک اسٹیشن
 پر، اور اگر ایک سے زیادہ اسٹیشن پر ٹھہرے تو عورت نہیں طوائف کہلاتی
 ہے۔ انتظار دہلوں کے لیے کرنا پڑتا ہے اور جو مزہ انتظار میں ہے وہ
 گاڑی پر چڑھنے میں نہیں عورت تک پہنچنے کے لیے اس سے شادی کرنا
 پڑتی ہے اور گاڑی کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے اور جو لوگ بے ٹکٹ
 سفر کرتے ہیں۔ وہ سماجی اعتبار سے بد اسنلاق سمجھے جاتے ہیں۔
 گاڑی ہو یا عورت۔۔۔ بے ٹکٹ سفر کرنے والے کو ہر حالت میں سزا ملتی ہے
 تو یہ۔ تو یہ کیسی بڑی بڑی باتیں سوچ رہا تھا وہ اس کے کنوڑے جذبات
 خطرناک حد تک بداخلاقی کے مرکب ہو رہے تھے۔ اب اُسے ازدواجی
 زندگی کا ٹکٹ خریدنا ہی پڑے گا۔

اب گاڑی ابھی چکے۔ اُس نے پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔
 ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے صرف دس منٹ ! اور وہ اپنی دانت
 میں کئی عرس گزار چکا تھا۔ وہ چھٹپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے
 میں آیا۔ پھر لپٹنے پھپن کے سہانے خوابوں کی سمت لوٹ چلا تھا لیکن
 گاڑی پھر بھی نہ آئی تھی۔ اور ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے اس نے پالش
 والے لڑکے کو آواز دی۔ اے اور لڑکے پالش والے !

پالش والا لوٹا ایک نیتھن میں انگلی ڈال کر گنگنے الفاظ میں بولا :

”صاحب ابھی تو ترا بوٹ پالش کیا ہے“

”کوئی ہرج نہیں۔ اسے پھر پالش سے اچھی طرح چمکا دے دیکھ اب
 کے اچھی طرح سے پالش کیجو دو آنے دوں گا۔“

پالش والے نے اس کے پاؤں اپنی پٹی ہوتی نیکر پر رکھ لیے۔ نیکر جو کبھی
 خاکی رنگ کی تھی۔ لیکن اب جگہ جگہ سے پھٹ کر بے رنگ ہو چکی تھی۔
 پالش والے کی ٹانگوں پر چھوٹے چھوٹے بے شمار زخم اور پھینسیاں تھیں اس
 کے ننگے پاؤں میں بیاضیاں پھوٹ آئی تھیں۔ اور اُس کی ناک سے نزلہ سُتر سُتر
 کر کے بہتا تھا۔ لیکن پالش والا لوٹا بھی بڑا ہوشیار تھا۔ وہ اپنے

بہتے بھنے نہ لے کو ایک ہی بار سانس کھینچ کر فوراً ناک کے اندر لے جاتا تھا تھوڑی دیر کے بعد نزلہ پھر اس کے نھنوں سے بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب گرا۔ یہ نزلہ میرے بوٹ پر آب گرا۔ لیکن پالش والا لونڈا بڑا ہوشیار تھا اس نے پھر زور سے سانس لے کر نزلہ کے لعاب کو ناک کے اندر کھینچ لیا اور برش کو زور زور سے بوٹ پر رگڑنے لگا گاڑی پھر بھی نہ آئی۔ شاید یہ گاڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے پالش والے سے کہا۔ بوٹ کے تسمے کھول دو۔ اور بوٹ الگ لے جا کر پالش کرو۔ اس نے سوچا۔ چلو تسمے کھولنے ہی میں کچھ وقت صرف ہو گا۔

گاڑی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ پلیٹ فارم کی گھڑی اس قدر سست کیوں ہے۔ بارش اس طرح کیوں برس رہی ہے۔ کیا یہ اب کبھی نہیں گئے گی! ریلوے والوں نے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے بنچوں کے سامنے کھیر لی لگا دیے تھے۔ پر تسمے کے لیے نہیں، بارش کی بو چھاڑ سے بچنے کے لیے وہ ریلوے کا تہ دل سے شکر گزار تھا۔ لیکن اُسے اس وقت کھیر لی کی نہیں، ایک گاڑی کی سخت ضرورت تھی جو اُسے چند لمحوں میں ملاڈ سے چرچ گیٹ پہنچائے۔ جہاں اس کی محبوبہ اس کا انتظار

کر رہی تھی۔

چرچ گیٹ پر اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے اور وہ ملاٹ میں
مکڑی کے ایک گلیے ٹرے بوسیدہ بیچ پھینچا اپنے جوتوں پر پالش کر رہا ہے
اور پالش والے نوٹے کی ناک سے ہوتا ہوا نزلہ دیکھ دیکھ کر خود کشتی پر آمانہ ہو
رہا ہے۔ گاڑی نہیں آئی۔ ضرور کوئی حادثہ ہو گیا ہے کوئی کھمبا گرا ہو گا یا بڑا آدمی
پسندوں نے پٹری توڑ دی ہوگی۔ ریل الٹ گئی ہوگی، یہ گھڑی غلط ہوگی۔
بجلی کے تار فیمل سے گئے ہوں گے۔ سگنل نہ ملا ہوگا۔ راستے میں پل ٹوٹا ہوگا۔
سمندر کا پانی ٹھاٹھیں اڑا رہا ہوگا گاڑی کے سر سے گزر گیا ہوگا۔ ورنہ گاڑی ابھی
تک آگئی ہوتی!

آج فتح کی خوشی میں وہ چرچ گیٹ جا رہا تھا۔ جہاں نیلا ریشمی سایہ پہنے
اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ آج اُس نے وہی
نیلا ریشمی سایہ پہنا ہوگا جو اسے بہت لہند ہے۔ اور جس کے دام ابھی
اُس نے دزدی کو ادا نہیں کیے۔ کانوں میں الکترو پلٹنگ کل کے آؤنٹے
ہوں گے۔ بڑے بڑے ہلالی آؤنٹے۔ عید کے چاند کی طرح خوبصورت
اور ان آؤنٹوں کے بیچ میں موتی ٹکے ہوں گے۔ موتی، آبدار موتی، دکھڑے موتی

چمکدار موتی، طرح دار موتی ایں۔ اُس نے اپنے اُلجھے ہوئے تصور میں کوئی نیا
 کو بازی کتابوں کے ناموں سے کیوں گٹھڑ کر دیا تھا۔ اس کی محبوبہ تو بازی تھی
 بے حد شریف لڑکی، نیلا سایہ اور سفید سینڈل پہننے والی لڑکی۔ گوڑے گورے
 چمکے خنداں والی ہنس ہنس کر اُتو بنانے والی لڑکی اور پھر سچے مگر راجہ کی لڑکی
 نکلا ہوں سے خراج وصول کرنے والی۔ بے حد شریف کنواری لڑکی پھر
 لکھتی خاندانی لڑکی، چرچ گیٹ پرائس کا انتظار کر رہی تھی اور گاڑی ابھی آئی
 نہ تھی۔ اور آج فتح کا دن تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی۔ اور دنیا نے
 تھک کر امن و چین کا سانس لیا تھا، جرمنی — اور پھر جاپان
 شکست خوردہ ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے اور اُس کی محبوبہ نے نیلا ریشمی
 سایہ پہنا تھا۔ جس میں اُس کا چہرہ رانا زک قناسب جسم کنواری بہاروں
 کی طرح شگفتہ و شاداب نظر آتا تھا۔ دنیا میں بہار آگئی تھی اور وہ ملاٹ میں
 جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔

آج گاڑی نہیں آئے گی۔ آج وہ فتح کا جشن نہیں مناسکے گا۔ امن کی
 مستروں میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ فورٹ ایریا میں حکومتی ہوئی، رقمقور
 جگمگاتی ہوئی ٹراموں کی روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ ڈیمو کراسی کے سپاہیوں

کو جام پر جام لٹھکتے اور ابدی امن کے ترانے گاتے نہ سن سکے گا۔
 ناچ گھر میں نیلے سایہ کے محور کے گرد طواف نہ کر سکے گا جو ٹھوکے ساحل
 کی ریشمی ریت پر لٹا کر اُس کے ہونٹ نہ چوم سکے گا۔ بس آج وہ جوتے
 پالش کرائے گا۔ اور ناک سے بہتے پتے تڑپے کو اندر سے باہر اور باہر
 سے اندر جاتے ہوئے دیکھتا ہے گا۔ اور اس کی محبوبہ ناامید ہو کر واپس
 چلی جائے گی اور قہقہے سمجھ جائیں گے اور مسکراہٹ سمجھ جائے گی اور
 مسرت کے ترانے خاموش ہو جائیں گے اور بھیگی بھیگی لکھا س پر میڈیک
 ٹراتے رہیں گے اور لا پرواہ جینسوں کے پاؤں تلے کچلے اور ملے جائیں گے
 بالکل اسی طرح جیسے اب اس کا دل مسلا اور کچلا جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی نہیں
 آئی تھی۔ فرطِ یاس سے مغلوب ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سب پہلے اُس کی نگاہ ایک ٹوکے
 پر پڑی جو اب اس کے قدموں کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا جو
 ابھی ابھی یہاں رکھا گیا تھا۔ اس ٹوکے میں مچھلیاں تھیں، بزمدری مچھلیاں
 موٹی پتلی۔ اُلٹی سیدھی، چھوٹی بڑی ہر قسم کی مچھلیاں — اور اس ٹوکے

کے پاس ایک نیم برہنہ انسان بیٹھا تھا۔ جس سے تاڑی پی رکھی تھی۔ اور جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکارتا تھا۔ اُس کا سیاہ گٹھا ہوا جسم خوبصورت تھا۔ دانت مضبوط اور سپید، دھڑے اور پرزنگا، پاؤں ننگے اور ادھی رانیں بھی ننگی صرف کمر کے اوپر کسی پرانی دھوئی کا چھتھڑا تھا، گیلیا پتلا، بارش کے پانی سے شفاف ہو گیا تھا۔ کپڑا نہ تھا۔ ایک آئینہ تھا جس میں انسانیت کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ ماہی گیر تھا۔ اس کے خدو خال بھیلوں کے سے تھے آنکھوں میں جنگلی وحشت تھی۔ بازوؤں میں ایک رُکی ہوئی جابر تو انانی، اعضا میں اک لچک، لوچ اور گھلاوٹ، جیسے وہ کسی مذہب سبتی کا انسان نہ تھا۔ جنگل کا خوبصورت جانور تھا۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لایا تھا۔ اور تاڑی پی کر سنس رہا تھا۔

قریب ہی اس کی بہوی بیٹی تھی۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی۔ اور ایک نحیف و نزار بچے کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھی۔ اور اپنے تندرست تھنوں سے اسے دودھ پلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بلند آوازیں اپنی ناکامی کا ماتم بھی کرتی جا رہی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اُس کے بہنٹوں سے

ٹپک رہی تھی۔ اور وہ ایک بچے کی طرح تھی۔ جس کا عزیز ترین کھلونا اس سے چھینا جا رہا ہو۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا تحیف و نزار بیا بچہ قے پر قے کر رہا تھا۔ اور اس کا دم اُلٹ رہا تھا اور پلیٹ فارم کا فرش غلیظ ہو گیا تھا اور بچے کی گردن ایک طرف جھک گئی تھی۔ اور وہ بھیل یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور اس نے تارڑی پی رکھی تھی۔

بچے نے پھرتے کی، اور وہ لڑکی زور زور سے چلانے لگی اور بھیل اُسے پیٹنے لگا اور لڑکی نے ساگ کا اٹھا بھیل کے سر پر ڈے مارا۔ اور لوگ ہنسنے لگے اور پھر وہ بھیل خود بھی ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہیں تھا۔ پاگل تھا۔ ایسی بھی کیا ہنسی۔ مانا کہ آج جشنِ آزادی ہے۔ جشنِ فتح ہے۔ آج دنیا کو فاشیت کے چنگل سے نجات ملی ہے۔ اور ہندوستانی کا ہر ہوٹل مسرت کے نغمے گار رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کریں بے سوچے سمجھے تارڑی پی کر رہنا جانتے۔

چھوٹے بچے کا سر ایک طرف ٹھٹھک گیا تھا اور وہ نیم برہمہ بھیلنی بیٹھی ہوئی اپنی پٹی ہوتی دھوتی سے اس کی قے صاف کر رہی تھی۔ اور

پولیس مین اسے اس طرح غلاطت پھیلائے پرگالیاں مسدود تھا۔ اور اس کے پستانانہنگے تھے۔ اُس کی باہیں ننگی تھیں۔ اور کاٹھن ملر کیٹس پر کروٹوں میں روئی کے انبار لگے تھے۔ اور اس کا پیٹ ننگا تھا۔ اور اس پر اک خوفناک ناگ کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ اور اس کی بانہوں پر بھی خوفناک دیوتاؤں کی سبز تصاویر کھدی تھیں۔ شاگ اچھنج میں سونے چاند اور روئی کا بھاؤ گر رہا تھا۔ لیکن وہ نیم برہنہ تھی۔ اور اُس کی ننگی باہوں میں لکڑی کے موٹے کرے تھے۔ سونے کے نہیں، چاندی کے نہیں، ہٹیل یا تلبے کے بھی نہیں صرف لکڑی کے۔ اور ٹخنوں پر پائل کی تصویر کھدی تھی۔ کیونکہ جب عورت کو زیور نہ ملے تو وہ اُس کی تصویر دیکھ کر ہی کیوں نہ خوش ہو۔۔۔۔۔؟

اس کا لڑکا اس کی گرد میں دم توڑ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ اور پولیس مین اسے گالیاں مے رہا تھا۔ اور اُس کا خاندنہ ٹاڑی کے نشے میں دھت، اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ وہ ننگا تھا۔ اور اس کی ہیری ننگی تھی اور اُن کے آنسو ننگے تھے اور ان کی ہنسی ننگی تھی۔ کیونکہ بھیل سے اس کا جنگل چھن گیا تھا۔ اُس کا درس چھن گیا تھا اُس کے تیر و کماں

چھن گئے تھے۔ اب وہ اپنے گھر میں بے گھر تھا بے ہتھیار تھا بے علم تھا۔ جنگل چھنا۔ لیکن شہر نہ ملا۔ جنگل کی چھال چھنی لیکن روٹی کا سوت نہ ملا۔ ٹکڑا چھنا۔ لیکن روٹی نہ ملی۔ تیردکان چھنے۔ لیکن بندوق نہ ملی۔ جڑی بوٹی چھنی لیکن دوا نہ ملی۔ وہ نہتا تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ اور مچھلیوں کا ٹوکرا لیے پلیٹ فارم پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ اس نئی دنیا میں جہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

اس کا جھوٹا ہوا سر اور بھی جھولنے لگا۔ اور ریل کے کھجے کا سہارا لے کر اپنے پیٹ پر جھبک گیا۔ یکا یک اُس کی بیوی نے ایک چینگے ساتھ اپنے سر کو دوہتر سے پیٹ ڈالا۔ کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بار بار قے کرنے والا غلیظ لڑکا اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور وہ بیوقوف عورت بار بار اپنے جوان پستان اس کے مردہ ہونٹوں میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لیے کہ اس کی بامتا کے پاس اپنے دودھ بھجے پستانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوا کیا ہے۔ کھانا کسے کہتے ہیں مکھن اور دودھ، گلو کو کس اور وٹامن اور کالوے کو روکنے والے انجکشن اور ڈاکٹر لوگ یہ سب کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

ریشم کیا ہے۔ سینڈل کیا ہے۔ پتلا سایہ کیا ہے۔ آرام کیا ہے۔ کتاب کیا ہے
 علم کیا ہے۔ تہذیب کیا ہے۔ ہونٹ کیسے مسکراتے ہیں۔ آنکھیں کیسے جھپکتی ہیں۔
 سانس میں خوشبو کا تعطر کیسے پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ فتح
 کسے کہتے ہیں۔ فاشنزم اور ڈیموکریسی اور جنگ اور امن میں کیا تفریق ہے۔ اسے
 کچھ بھی تو معلوم نہ تھا۔ وہ یکایک اپنے مردہ بچے کو لے کر کھڑی ہو گئی۔ چمکتے ہوئے
 بالوں والی عورتوں سے جوئیں چھننے والے امیر و کبیر مارواڑی سے
 سیٹھی بجاتے اور اپنی بتوں کی نوک پلک سنوارتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر
 سے اس کی حیران پھٹی پھٹی نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کے چمکدار
 بوٹ کی نوک سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور جب کہیں بھی انھیں اپنے سوال
 کا جواب نہ ملا تو اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں اور ہر سال ہو کر زمین پر
 بیٹھ گئی۔ جیسے اس نے اس ذلیل مضافاتی اسٹیشن پر آدمیوں کا نہیں
 چٹانوں کا منہ دیکھا تھا۔

گاڑی اب دور سے نظر آ رہی تھی۔ اور اس کا جو شفاف آئینے کی
 طرح چمک رہا تھا اور اس نے صاف ستھرے چمکتے ہوئے جوتے کی
 نوک سے جھولتے ہوئے بھیل کو ایک شوکا دیا۔ بھیل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

گاڑی اگنی بھیل نے اپنے سر پر مردہ مچھلیوں کا ٹکرا رکھا، بغل میں مردہ
 بچے کو دبایا۔ ہاتھ سے سسکی ہوئی بیوی کو پکڑا اور تھرڈ کے ایک ڈبے
 میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہوں میں وہی وحشت تھی۔ لبوں پر وہی ہنسی
 اور — وہ — فرسٹ کلاس کے نرم گدیے پر بیٹھ کر بھی اکبر مر
 سا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے بزدل ذہن میں لکھوں کروڑوں ننگے،
 بھوکے پیاسے بیار آدمی ابھر رہے تھے۔ گھٹتے چلے آ رہے تھے۔ اُس کے ذہن
 کے نرم نرم گدا گدیوں پر بیٹھنے جا رہے تھے۔ اور اُس کی طرف دیکھ دیکھ
 کر ہنس رہے تھے۔ یہ ہنسی کیا ہے۔ یہ میسے گلے میں پھندا سا کیوں ہے۔ یہ
 کس کے ہاتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ پھیلے پھیلے، ٹیڑھے ٹیڑھے لمبے
 لمبے ہاتھ، سوکھے سکرٹے، سسے سسے ہاتھ، کمزور ہاتھ، قوی ہاتھ، وحشی ہاتھ
 بزدل ہاتھ، دلیر ہاتھ، کالے ہاتھ، گوسے ہاتھ، پیلے ہاتھ، کرنجی بدنما ہاتھ، ہاتھ
 — جن پر زخموں کے نشانی تھے۔ کوڑوں کے نشانی تھے۔ ہل کی ہتھی
 کے نشان تھے۔ مٹین چلانے کے نشان تھے۔ تیل کے نشان تھے۔ گویوں
 کے نشان تھے — ہاتھ — جن پر انکا اس زخمیں شکستہ بوڑھے ہاتھ —
 جن پر نیلی دہریں ابھری ہوئی تھیں۔ کانپتے ہوئے ٹھنڈے، خون سے لڈتے

بھوت

بھوتے لمبے لمبے ناخن والے ہاتھ جو ننگے تھے۔ اور خون آنود تھے اور
 ناسوروں سے بھرے بھوتے تھے اور اس پر ہنس رہے تھے۔ ان کی
 خاموشی میں ایک مہیب گویائی تھی۔ ان کے تاریک سایوں میں ایک
 عجیب گونج تھی۔ کسی خوفناک طوفان کی گونج..... اور یہ ہاتھ بھڑکتے چلے
 آ رہے تھے۔ لگے، اور آگے قریب اور قریب.....!

وہ چیخ مار کر صوفے پر سے اچھل پڑا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک انگوڑے
 سپاہی اپنی سانولی مجبور سے جس نے ریشمی نیلا سایہ پہن رکھا تھا اظہارِ محبت
 کر رہا تھا۔ انگریز سپاہی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے جانی؟ ڈر گئے تھے کیا؟“

”ہاں میں واقعی ڈر گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”کس سے؟“

”ابھی ابھی میں نے اک بھوت دیکھا تھا۔“

”بھوت؟ اس گاڑی میں؟“ ساتھی نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”نہیں سچ کہتا ہوں۔ بھوت تھا!“

”کس کا بھوت تھا؟“ اس نے اپنی محبوبہ کی ترش ہوتی زلفوں سے
 کیپٹے ہوئے پوچھا۔

”تیسری جنگِ عظیم کا بھوت“ اُس نے رکتے رکتے کہا۔
 انگریز سپاہی اور اس کی سانولی محبوبہ کے چہرے فی تہو گئے۔ ٹپتے
 میں سناٹا چھا گیا۔ موت کا سا سکوت، جیسے اب وہاں کوئی نہ تھا اور
 اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ڈبے کے کسی کونے میں کھڑا ہوا وہ بھیل ابھی تک
 ہنس رہا ہے!

تین غنڈے

اس کا نام عبد الصمد تھا۔ وہ بھٹی بازار میں رہتا تھا۔ محض اسی لیے بہت سے لوگ اُسے غنڈہ کہتے تھے۔ ہر گارجہ الصمد بھی غنڈہ۔ گو اس بے چارے کو زندگی بھر یہ پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے۔ بالعموم لوگوں کو اپنی زندگی میں اپنے باسے میں تھوڑا بہت معلوم رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ انھیں اچھا سمجھتے ہیں۔ یا بُرا۔ وہ شریف ہیں یا بد معاش، عورتوں کو اپنی ماں بہن سمجھتے ہیں یا اپنی ہونے والی محبوبہ، وہ دیانت دار سمجھے جاتے ہیں یا جھوٹے۔ دروغ گو، فاسد یا امن پسند انھیں کچھ نہ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے اپنے متعلق۔ لیکن بیچارے عبد الصمد کو آج تک کمر میں گولی لگنے تک

تین غنڈے

پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے اسے گولی کیسے لگی یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عبد الصمد ایک غنڈہ تھا جو فائن آرٹ اینڈ پرنٹنگ ورکس میں کام کرتا تھا جو وزیر مستور ان کے قریب ایک سرخ اینٹوں والی دو منزلہ عمارت میں واقع ہے اور جس کے سامنے ٹرام کا اڈہ ہے اور جہاں کل جن کو ٹنڈہ ہو چکا ہے ہندوستانی اور انگریزوں کی دیرینہ رقابت کی وجہ سے اس رڑائی میں ہندوستانیوں کی ہزاروں جانوں کا نقصان ہو رہا ہے لیکن بے چارے انگریزوں کے کئی ہزار کارٹوس مفت میں پسٹک گئے۔

عبد الصمد سی فائن آرٹ پریس میں ملازم تھا۔ لشکر کے بھاری پتھر اٹھا کے مشین پر جاتا تھا۔ یہ اس کا کام تھا۔ دوسرے مزدور تو مشکل سے ایک پتھر ایک وقت میں اٹھا سکتے تھے لیکن عبد الصمد کے کام کرنے کا انداز یہ تھا۔ کہ پانی کی پیک ٹور سے سامنے تالی میں پھینک کر ایک موٹی سی گالی دے کے وہ بیک وقت دو پتھر اٹھا لیتا اور انہیں جان عزیز کی طرح سینے سے لگاتے ہوئے منیجر کی میز کے پاس سے گزر کر سگڑا کر ایک آنکھ میچی کر دل ہی دل میں منیجر کو ایک موٹی سی گالی دے کر وہ دونوں پتھر مشینوں

پر حملے کے لیے جاتا۔ اور سنس کر مشین میں سے کتا، بوٹا بھیکے ابطنی
 جماد مشین پہلانے کو فلفنی جہانا کتا تھا۔ دراصل اس کی اپنی زبان تھی جس میں
 وہ زندگی کے اہم موضوعات پر گفتگو کیا کرتا۔ جب مالک پر اس میں آتا تو چپکے
 چپکے مزدوروں سے کتا، شیر، یا شیر کرا دوڑنا۔ جب مالک نہ ہوتا اور منجروں
 سے چلانے لگتا۔ تو کتا کام کر دے۔ کرو کام سُور کی اولاد۔ دیکھتے نہیں ہو
 گیدڑ کی بیوی رو رہی ہے۔ جب تنخواہ کا دن آتا تو کتا۔ آج بیچا لے
 لا چٹم بچتا ہو گیا۔ یہ چٹم بچتا کس زبان کا لفظ تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے
 کہاں سے سیکھا تھا۔ اس امر کو کئی نہیں جانتا۔ یہ عبد الصمد کی زبان تھی وہ اس
 کا مالک تھا اور اسے جس طرح چاہے استعمال کرتا۔ اسے کون روک سکتا
 تھا۔ زبان کے سلسلے میں اسے سب سے زیادہ عبور گائیوں پر تھا۔ میں
 نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا کہ جو عبد الصمد سے بہتر گالی دے سکتا
 ہو تیرہی دل کے دودھ میں حکم کا یکتا۔ ایسی گالی کوئی شاعر ہی دے سکتا ہے
 اور گالیوں کے سلسلے میں عبد الصمد ایک شاعر تھا۔ جن کا ارتقا فصاحت
 بلاغت کا بادشاہ تھا جب گالی دیتا تو اس کے انداز میں ایک ایسی خطا
 ہوتی اور زبان و بیان میں وہ روانی ہوتی کہ مجھے ہندوستان کے بہترین

سیاست دان یاد آجاتے جو اکثر باتیں زیادہ کہتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔ لیکن عبدالصمد میں یہ ایک خاص بات تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا تھا تو کام بھی بہت اچھا کرتا تھا۔ پریس کے مینیجر کو وہ اپنی بدزبانی کی وجہ سے ناپسند تھا۔ لیکن کام اتنا اچھا کرتا تھا کہ وہ اسے پریس سے نکالنا نہ چاہتا تھا یہ عجیب بات ہے اور ممکن ہے آپ نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ کہ جتنے غنڈے ہوتے ہیں۔ کام کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سب کے اچھے مزدور بھی غنڈے ہوتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے۔

ہے نا!

عبدالصمد ایک اچھا مزدور تھا۔ اور اگر اس میں بات بنانے۔ گالی بکھنے اور بلاوجہ لوگوں پر ہنسنے کی عادت نہ ہوتی تو وہ ایک اچھا آدمی بھی ہوتا۔ ہاں وہ ہر وقت پان کھاتا تھا جس سے اس کے بڑے بڑے دانت اور بھی کرہید معلوم ہوتے تھے۔ گالی بکھنے میں اسے وہ کمال حاصل تھا۔ کہ بڑے بڑے ادیبوں کو عمر بھر کی محنت کے بعد بھی وہ طرزِ انشاء نصیب نہیں ہو سکتا اور ہنسی اس کی ہنسی سب سے بڑی تھی۔ پاٹ دار، گونجدار، بلند و بالا، ہنسی جو پریس کی تاریک عمارت اور خاص کر جس کمرے میں وہ

تین غنڈے

کام کرتا تھا۔ اس کے لیے قطعی طور پر ناموزوں تھی۔ یہ ہنسی یاد دلاتی تھی۔ پہاڑوں کی جہاں صنوبروں کے جنگل کھڑے ہیں۔ وسیع میدانوں کی جہاں میلوں تک گیسوں کے کھیت کھڑے ہیں، تاروں بھری رات کی جب سب سو جاتے ہیں اور رات کی رانی اس افق سے اُس افق تک نفیس پھیلائے سورج کی کرفوں کا انتظار کرتی ہے۔ یہ ہنسی جو گریہ سمندر کا سینہ چیر کے نکلی تھی اور ساری دھرتی پر پھیلتی جا رہی تھی۔ انسان کی ہنسی نہیں کسی یو کی ہنسی معلوم ہوتی تھی۔ کرخت، بُری، گندی، ابھری ہوئی، بڑھتی ہوئی، پرسی کی محدود تاریک چار دیواری کے لیے قطعی نامزد تھی۔ اس پر بھی عبد الصمد اکثر ہنسارہتا تھا گالی بکاتا رہتا تھا۔ اور منجر کے سامنے لیتھو کے پتھر اٹھائے اکڑتا چلا جاتا تھا۔ غنڈا !

میں نے پہلی بار اسے فائن آرٹ پریس میں دیکھا تو ایک سخت کراہیت اور نفرت کا احساس میرے دل میں پیدا ہوا۔ جے جے ہسپتال کے رنٹ کے لوگ اکٹھے محفلِ رقص و سرود منعقد کرنا چاہتے تھے۔ اور میں اس کنسرٹ کا پروگرام شائع کرانے کے لیے پریس میں آیا تھا۔ یہاں میں نے عبد الصمد کو پہلی بار دیکھا۔ آپ بڑے ٹھٹھے سے کمر پکات لکھے فرما رہے

تھے۔ ”وہ لیتھو کا پتھر مجھ سے ٹوٹ گیا۔ مینجر صاحب“
 ”کیسے ٹوٹ گیا؟“

”یہ یکے بتاؤں بس بات سے چھوٹ گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا۔ دیکھئے
 اس مادہ چود پتھر کو آج ہی ٹوٹنا تھا۔ دو سال ہو گئے مجھے اس حرامی پریس
 میں کام کرتے ہوئے۔ دیکھئے کبھی ایسی واردات نہیں ہوتی؟ یہ کہہ کر
 آپ نے سر کھجایا اور سر سے ایک جوں نکال کر اُسے اپنے ناخنوں کی چکی
 میں پیستے ہوئے لولے ”ہت تیری جوں کے منہ میں سُور کے کباب!“
 مینجر لڑا۔ ”سیدھی طرح بات کر دو“

”سیدھی طرح تو کہہ رہا ہوں جناب مہنی جو صاحب۔ لیتھو کا پتھر ہم سے
 ٹوٹ گیا۔ معافی چاہیے؟“ یہ کہہ کر منہ لگا۔ گویا معافی مانگا اُسے عجیب
 سا لگ رہا تھا۔ اس کے دانت اور اس کے مسوٹھے بلکہ اس کا حلق
 اور التومک مجھے نظر آ رہا تھا میں ذرا پر سے ہٹ گیا۔ کیونکہ اس کے
 جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی تھی۔ ہر غنڈے کے جسم سے بو آتی ہے
 زمین کی بو، پسینے کی بو اور پیاز کی بو۔ اور گو اس کا جسم بدبو دار تھا۔ اس کا
 دل بدبو دار نہیں تھا۔ جس طرح اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ شریر اکھیں گھٹنے

تین خٹے

ابروؤں کے نیچے چمکتی تھیں۔ اس میں کوئی بدلہ نہ تھی۔ دس تا بیس کوجب اُسے تنہا دلتی اور وہ منہ بھر صاحب کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتا ایسی نگاہیں جن میں تشکر کے علاوہ حیرت ہوتی اور ایک ایسا جذبہ جیسے وہ نگاہ کہ رہی ہے۔ تو منہ نہیں ہے تو میرا بھاتی ہے بہم دونوں انسان ہیں۔ اس جذبے میں بھی کوئی بدلہ نہ تھی اور اس کی مسکراہٹ، غلیظ مسکراہٹ جس میں پریس کاپینٹ اور مشینوں کا آئیل گھٹا ہوا تھا اس میں بھی کوئی بدلہ نہ تھی۔ لیکن اس کا جسم بدلہ دیتا تھا۔ اس کے مسوٹے غلیظ تھے۔ اس کی باہروں کے مسل پتھوے ٹھوٹے تھے۔ اور وہ گالی بکتا تھا۔ اور ہر وقت لڑائی کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ وہ غنڈا تھا، غنڈا اور جب منہ بھرے اسے اس طرح ہنستے ہوئے معافی مانگتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی ایک غیر آدمی کے سامنے، تو اس کے دل میں غلیظ و خضب کا اک طوفان اٹھ اٹھا اور اس نے بات میں بکڑی کارول لے کر میز پر زو سے مارا اور عبدالصمد کو بلند آواز میں گالی شے کے کہا کہ وہ کبھی اس کا قصہ و سواقت نہیں کرے گا یہ تھو کا پتھر بہت ہلکا ہے تمہیں معلوم نہیں ہے۔ بوریہ سے آتا ہے جو جمنی میں واقع ہے تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اور آج کل بڑی مشکل ہے

دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ جرمنی کو اتحادیوں نے شکست دے دی ہے
تعمین معلوم نہیں ہے آج کل پتھر بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔

عبد الصمد نے جواب دیا: مجھے سب معلوم ہے۔ پتھر تو ہندوستان
میں ہی آتے ہیں کہ ایک پوری فوج پتھر مارا مار کے ہندوستان سے باہر
نکالی جاسکتی ہے۔ پتھر تو ملتا ہے منیجر صاحب۔ لیکن روٹی نہیں ملتی گالی
کے بغیر بے عزتی کے بغیر منیجر صاحب اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ گالی دینے
میں آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ کہہ کر عبد الصمد نے جو منیجر کی ماں
کے دودھ میں حکم کا یکہ بھیننا شروع کیا تو سارے پریس والے اس کے گرد
جمع ہو گئے۔ منیجر نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی عبد الصمد نے
کہا: ”گھر رکھو اپنے پتھر۔ عبد الصمد عبد الصمد ہے۔ اس کا چٹم بشتا نہیں
ہو سکتا۔ پتھر ٹوٹ گیا تو ہم کیا کریں۔ اپنے چٹم چوڑا کاٹ کے رکھ دیں
پریس میں، واہ منیجر صاحب اور اوپر سے گالی دیتے ہو۔ ہم کام نہیں
کریں گے کبھی کام نہیں کریں گے۔ اس سارے پریس میں۔ ہم ابھی چلے
جاتے ہیں۔ فوراً اسی وقت چلے جاتے ہیں۔“ عبد الصمد دیر تک اسی
طرح بکتا جھکتا رہا لیکن پریس چھوڑ کے گیا نہیں۔ اس معاملے میں اس کی

سیاست انگریزوں سے ملتی بھلتی ہے جو ہمیشہ ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں لیکن کمبخت جلتے نہیں خیر وہ خود نہیں گیا، تو دوسرے روز منجھرنے پر سی کے مالک سے کہہ سُن کے عبد الصمد کو دہلی سے نکلوا دیا۔ یہ فسادے دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے اگلے روز عبد الصمد کو دیکھا کہ سڑکوں پر اور بھنڈی بازار کے مختلف راستوں پر اور دوسرے غنڈوں کے ساتھ مل کر شور و واویلا کرتا تھا اور ہڑتال کر رہا تھا ایک جگہ سڑک چنڈی نگر جو مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈ ہیں تقریر کر رہے تھے۔ ہمیں اس ہڑتال میں، اس فساد میں، اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ یہ سب کانگرس کی شرارت ہے۔ تو اس وقت بھی عبد الصمد اور اس کے ساتھی غنڈوں نے شور مچا کر اس امن پسند لیڈ کی ایک ٹپلنے دی اور ”جے ہند“ اور ”ہندوستانی جہازی ہڑتال زندہ باد“ کے نعرے لگانا کے اے جلسے سے باہر کر دیا اور پھر میں نے سنا کہ ان لوگوں نے ہڑتال کی اور ٹرامیں اور ٹرام کے ٹیڈ جلا دیے اور ان تمام کاموں میں عبد الصمد بھی شامل تھا لیکن ان باتوں کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ چند ریگہ کی میٹنگ کے بعد میں نے عبد الصمد کو جے جے ہسپتال میں دیکھا۔ گولی اس کی پیٹھ میں کمر کے پاس لگی

تین غنڈے

تھی اور پیٹ بھاڑ کے باہر مہو گئی تھی۔ مکر کے پاس ایک چھوٹا سا سونہ تھا۔
 جہاں گولی اندر داخل ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف پیٹ میں ایک بہت
 بڑا زخم تھا جو ہزاروں چھروں سے پیدا ہوا تھا۔ یہ کارٹوس ڈم ڈم والی
 گولی والا کارٹوس نہ تھا جو گذشتہ خند میں استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ایک نیا کارٹوس
 تھا۔ نیا اور خوفناک جو جسم کے اندر جا کے پھیل جاتا ہے۔ اور سینکڑوں چھوٹے
 چھوٹے زخم پیدا کر سکتا ہے۔ ماننے کو تو انسان کو یوں بھی ایک معمولی سے
 کارٹوس سے مارا جا سکتا ہے۔ لیکن غنڈوں کے لیے اس قسم کا کارٹوس
 خدا اچھا رہتا ہے۔ یہاں سے ہاں یہ کارٹوس شور کے شکار کے لیے استعمال
 ہوتے ہیں۔ خیر غنڈے تو سوڑے بدتر ہوتے ہیں۔ اچھا ہوا عبدالصمد مر گیا۔
 عبدالصمد مر گیا اور اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ عمر چوبیس سال۔
 ذات راجپوت۔ مذہب سلمان۔ غیر شادی شدہ آنکھوں کی جھپک مردہ،
 لبوں کی ہنسی مردہ۔ زندگی بخش گالی مردہ۔ ہر چیز کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا
 اور وہ میرے سامنے ذات پھیلائے، منہ کھولے۔ مردہ پڑا تھا۔ ایک
 طعن، ایک تارک مستقبل۔ ایک خاموش گالی۔ اور اس کی ماں اپنی
 چھاتی دھتر کوٹ رہی تھی اور میں کر رہی تھی اور ہسپتال کے باہر خیے میں

بیٹھے تھتے سپاہیوں کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ میرے بیٹے نے ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا۔ میرا بیٹا کیوں مر گیا۔ کیوں گولی اسے لگی۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو گلی میں بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی اینگلو انڈین لڑکی کو بچانے کے لیے باہر نکلا تھا اور کس نے اس کی پیٹھ میں گولی ڈی لڑکی بچ گئی۔ لیکن میرا جوان — ہونہار بیٹا۔ ڈاکٹر! میرا بیٹا اس جہان میں نہیں ہے وہ کیوں مارا گیا ڈاکٹر خدا کے لیے مجھے بتاؤ وہ کیوں مارا گیا۔ اس لیے کہ وہ ایک غنڈہ تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا اور اس کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا اور دوسری لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسرے غنڈے سے میری ذاتات ایک بنٹے کے گھر پر ہوئی۔ مینڈھرسٹ روڈ جسے گنڈا اس روڈ کہتے ہیں۔ بڑے بڑے خیموں کا مسکن ہے۔ یہیں پدم سی میٹھ بھی رہتے ہیں، پدم سی میٹھ جے جے ہسپتال کے ڈاکٹروں میں بہت مقبول ہیں۔ کیونکہ آپ سب لوگ پر ایک سو میں پچھ سو دیتے ہیں۔ اور سارا معاملہ نہایت خاموشی سے طے کرتے ہیں۔ پدم سی میٹھ کا پہرہ بچوں کی طرح بوجھ لانا نظر آتا ہے۔ مگر اہٹ لگی میں چپڑی ہوئی

معلوم ہوتی ہے۔ اور لب و لہجہ میں راشن کے باوجود اتنی شکرگلی ہوئی ہے کہ چربا زار کا شبہ ہوتا ہے۔ ہم سی سیٹھ میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ مجھے قرض کی اکثر حاجت رہتی ہے۔ اور جو دوست مجھے روپیہ ترس نہ دے میں دُرا اسے دوست کم بناتا ہوں اور اور پھر ہم سی سیٹھ کوئی زیادہ سود نہیں لگاتے۔ سو روپے پر صرف ایک سو بیس روپے۔ اور پھر وہ بھی بغیر ضمانت کے۔ اب بتائیے اس سے اچھا سودا ہندوستان سے باہر کہاں ہو سکتا ہے آج بھی جب میں غنڈوں سے بچتا بچتا سینڈھرسٹ روڈ پر ہم سی سیٹھ کے مکان پر پہنچا تو انھوں نے میری بڑی آڈھکت کی۔ وہ مجھے کبھی نہیں ٹالتے ہمیشہ روپیے ڈیتے ہیں۔ یہ تو انھیں معلوم ہے کہ میں جے جے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے اور روپیہ مع سٹوڈا بھی کر دوں گا۔ انھیں میرے عشق کا پورا حال معلوم ہے۔ وہ اس فرس کو بھی جانتے ہیں۔ جو اس قدر خوبصورت اور مہنگی ہے کہ اس کے لیے ایک کنوڑے سے نوجوان ڈاکٹر کو ایک سو بیس روپے سیکڑہ سود دینا پڑتا ہے ہندوستان میں ایک تو عشق بہت مہنگا ہے اور پھر خلافِ قانون

تین غٹے

بھی ہے سماج نے اور سیاست اور حکومت نے محبت کو مصلحتانہ قرار دے رکھا ہے۔ آپ کسی انسان کو قتل کر سکتے ہیں مگر اس سے عشق نہیں کر سکتے اگر آپ کسی لڑکی سے کہنا چاہیں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تو وہ فوراً جواب دیتی ہے۔ کیوں کیا تیرے گھروں بہن نہیں ہے۔ گویا اس ملک میں عشق صرف ماں بہن تک محدود ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی عشق کرنے کی جرأت کرے تو جوتی کھاتا ہے۔ پٹا ہے یا گولی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان محبت کرنے کی نہیں نفرت کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں انسان انسان سے محبت نہیں کرتا ہے۔ نفرت کرتا ہے۔ لوگ حکومت سے، حکومت لوگوں سے ماں باپ بیٹوں سے۔ بیٹے ماں باپ سے نفرت کرتے ہیں، گھر میں چار دیواریں، کارخانوں میں، وفاتوں میں نفرت کا راج ہے۔ کانگریسی، لیگی، سوشلسٹ ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ انھیں جتنی نفرت ایک دوسرے سے ہے اتنی اجنبی حکومت سے نہیں جس کے یہ سب غلام ہیں، ہندوستان ایک صحرائے نفرت ہے۔ جہاں کہیں کہیں محبت کے ٹھکانے نظر آتے ہیں۔ ہوریہ، بنگال، آسام، دیہاتی لڑکینوں اور فلم سازوں اور عدم تشدد کے حامیوں نے اُگائے ہیں۔

چاروں طرف نفرت کی ریت ہے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔ شاید اس ملک کی آب و ہوا یہی ہے۔ بچائے پدم سی سیٹھ بھی اسی آب و ہوا میں رہتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک آدمی سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر اس نفرت میں کوئی شامل نہیں ہے تو وہ ان کی چھوٹی بیٹی — شاننا ہے۔ شاننا ایک پتلی دہلی ۹ سال کی گجراتی لڑکی ہے۔ جس کو خدا نے نہ خوبصورتی دی ہے نہ ڈرامن پتلی پتلی ٹانگیں، میلے ذراک سے باہر نکلتی ہوئی پتلی پتلی باہیں، سوکھا سوکھا سامنہ جیسے پیاس کھنچي کھنچي ہی نہیں، ہر وقت چلاتی رہتی ہے اور منہ میں مٹھائی ٹھونسے رہتی ہے۔ اس قدر بھوڑا بد مذاق، بد صورت لڑکی ہے کہ معاذ اللہ دیکھ کے متلی ہوتی ہے۔ مجھے تو ایک تو بچوں سے یونہی نفرت ہے۔ کب سخت جب دیکھیوں ہی بلا سچے سمجھے چلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کپڑا کر لیا رہے ہیں۔ تو کبھی آپ کا کوٹ کھینچ رہے ہیں، کبھی تھرا میٹر پر بات مارتے ہیں تو کبھی دیوار پچاندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی بچی جسے ایک پل قرار نہ ہو جس کی آواز بھی تیز اور کرخت ہو۔ اور جس کے لبوں سے ہر وقت جلیبی کی رال بہتی ہو۔ اور جس کا باپ مجھ سے ایک سو بیس روپے سودیتا ہو، آپ اس لڑکی سے میری محبت اور شفقت کا اندازہ کر سکتے ہیں خیر تو

تین خنڈے

اس روز جب میں دہاں پہنچا ہوں تو شاننا کمرے میں موجود تھی اور ادھر سے
 ادھر اور اس کمرے سے اس کمرے میں اچھل رہی تھی اور چلا رہی تھی اور جلیبیاں
 کھا رہی تھی پدم سی سیٹھ نے اسے ڈانٹا اور کہا "دوسرے کمرے میں بیٹھ جا۔
 دیکھتی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں" تو شاننا بسورتی ہوئی
 اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتی ہوئی اور شکایتی ٹکا ہوں سے مجھے گھورتی
 ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ باپ نے اسے جاتے دیکھ کر پھر کہا "اور دہاں
 دیکھ باہر نہ جانا بیٹا باہر ڈنگ ہے۔ پھر انھوں نے بھی کھولی اور لٹیم کی طرح
 ملاٹم آواز میں بولے "آپ کو کتنے روپے چارمیں ڈاکٹر صاحب" میں نے
 کہا "آج تو میں اپنی آخری قسط ادا کرنے آیا ہوں۔ فی الحال مجھے روپے نہیں
 چاہئیں۔ کیونکہ نرس سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لیے میرا عشق
 ختم سمجھئے" وہ ہنسنے "تو رسید کاٹ دوں" میں نے کہا "ہاں لائیے
 میں بھی دستخط کیے دیتا ہوں" چنانچہ رسید کاٹ دی گئی اور دستخط ہو گئے اور
 اشام واپس مل گیا اور پھر میں سگریٹ اور وہ بٹری پینے لگے اور ہونے
 لگیں جہاں بھر کی باتیں۔ روٹی کا بجاؤ سندا ہے اور سونے چاندی کا دھندا
 ہے اور شاگ کسجی گندا ہے اور گلے میں انگریزوں کا پھندا ہے۔ اور

”ہم تو ڈاکٹر صاحب رام آپ کا بھلا کرے بہت بری طرح پھنسنے ہیں۔
یہ سٹرنگ بیلنس میں نے کہا۔ جی ہاں یہ سٹرنگ بیلنس ہی تک معاملہ
رہتا تو غنیمت تھا۔ لیکن سیٹھ صاحب سٹرنگ بیلنس کی انہوں نے
ایک اور شق نکالی ہے اسے Carotia Artery کہتے ہیں۔“
”کیراٹڈ آرٹری کیا ہے؟“

”کیراٹڈ آرٹری کے ساتھ اینٹی بی ٹائی پوکاٹائی جرمی سائیدل لگا کے
ساتھ میں اس کو Anti Septic بھی کر دیا ہے۔ سیٹھ صاحب
”باپ اے“ سیٹھ صاحب چونکے ”تب تو معاملہ بہت ٹیڑھا ہے۔“
میں نے کہا ”جی ہاں انگریزی اخبار میں سب آیا ہے، آپ نے
پڑھا نہیں۔“

سیٹھ صاحب ہلے ”جی نہیں میں تو جنم بھومی پڑھتا ہوں۔ یہ تو چپا
ہوا آپ نے بتا دیا۔ ایک تو یہ فساد شروع ہے جہازوں نے ہڑتال کر رکھی
ہے۔ خندہ گردی ہو رہی ہے اور ادھر سے یہ اینٹی سپٹک آپ نے
بتا دیا میں تو صاحب چور بازار میں جتا روپیہ لگا رکھا ہے اب نکلواتا ہوں۔“
اتنا کہہ کے سیٹھ صاحب نے کروٹ بدلی۔ تو نیچے گلی میں کار کو رس

غنڈے کی بار بار آواز آئی۔ بولے دیکھا آپ نے ہڑتال کرنے سے یہ ہوتا ہے۔
یہ غنڈے بد معاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا
ہے۔ یہ غنڈے بد معاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ کارخانے جلانا
چاہتے ہیں۔ شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا ہے کلجگ
دھرم کا بیج نہیں۔ اس دھرتی پر۔

میں نے کہا: آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔

اتنے میں پھر گولی چلنے کی آواز آئی اور گلی میں آدھ بکا کی صدا بلند ہوئی
اور بچوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم بھاگے بھاگے کھڑکی کی طرف گئے اور
نیچے جھانک کر دیکھا تو یکایک سیٹھ نے بیچ مار دی اور پھر دھڑا دھڑا
سیریاں نیچے اترنے لگی۔ میں ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کوئی خاص بات
نہ ہوئی تھی۔ ہوا بیتا کر گلی کے نیچے پولس والوں سے آنکھ مچولی کھیلے تھے
یہ لوگ چھپ کے گلی کے دوسرے کونے میں چلے جاتے اور وہاں سے
پولس والوں پر بے ہند کے نعرے کہتے اور ان پر نکر تھکر کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے پھینکتے اور جب وہ پولس والے ان کو ڈرتے اور ان
کا تعاقب کرتے تو نیچے بھاگ کے ہنستے کھیلے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے

گلی کے دوسرے کٹر پر جا کھڑے تھے اور وہاں بھی اسی طرح پولس والوں سے کھیل کھیلتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اور یہ بچے دن بھر اسی طرح مشغول رہتے تھے کوئی دوسرا ملک ہوتا تو ان بچوں کی یہ شرارت کھیل سے تعبیر کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پولس کا سپاہی کسی شریک کے کان کھینچ دیتا۔ دیکھ بیٹا اسٹنڈ سے ایسا مت کیجھو اور معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔ لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نہ والا ہے اس ملک میں محبت نہیں نفرت کا راج ہے۔ اس لیے پولس والوں نے طرزی کو مدد کے لیے بلا لیا۔ اور سینڈ ہرسٹ روڈ پر آنکھ مچولی کا وہ دلچسپ کھیل شروع ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ بچے جب حسب معمول چنچتے چلاتے بکھر بھینکتے گلی کے کٹر پر پہنچے تو یہاں گولیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اور پھر وہ جب یہاں سے ہسٹ کے دوسرے کٹر پر پہنچے تو وہاں بھی گولیوں سے ان کی آؤ بھگت کی گئی بکھر کی گولیوں سے نہیں۔ کار تو س کی گولیوں سے۔ جب بچے زخمی اور جاں طلب ہو گئے وہاں سے بھاگے اور گلی کے تیسرے ناکے کی طرف چلے تو وہاں بھی آنکھ مچولی کھیلنے والے سپاہی بیٹھے تھے۔ دھڑا دھڑ گولیاں چلیں اور پھر اس کے بعد بھگت سناٹا ہو گیا چاروں طرف غبار مٹی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اب جے ہند کھنے والا کوئی نہ تھا۔ سپاہی چلے گئے پھر

یہ ایک رنگ لگی میں گھس آئے اور اپنے زخمی اور مردہ بچوں کو اٹھانے لگے اور باتیں اور بہنیں بھائی اور باپ دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ ہم سیٹھ نے اپنی زخمی شائستہ کو اٹھالیا اور ہم دونوں مل کے اُسے اوپر کمرے میں لے آئے۔ ہم سی دھاڑیں مار کر روتا تھا۔ شائستہ میں نے تجھ سے کہا تھا باہر نہ جانا، باہر نہ جانا، کبھی نہ جانا۔ وہ طوطے کی طرح رٹ رہا تھا اور ہاتھ ملتا جا رہا تھا اور وہ بد صورت گجراتی کچی بے ہند کہتے ہوئے مر رہی تھی اور اس کے منہ سے لہو ابل رہا تھا۔ اس کے منہ سے اس کی بانہوں سے اس کے سینے سے لہو نکل رہا تھا۔ اس کا جسم اپنے لہو کے رنگ میں رنگا گیا۔ سرخ رنگ لال اور حسنی۔ ماتھے کا سینہ و زوہ نوسال کی بچی آج بیاباں جا رہی تھی۔ ننھی معصوم دلہن، اس رنگ لے گویا اس کی بد صورتی غائب کر دی۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا اس کی باہیں گول اور گداز اور چھاتی ماں کے دودھ سے بھاری لے بن بیاباں دلہن آج تیری مانگ میں شہیدوں کا لہو ہے۔ تیری بڑی بڑی آنکھوں میں اُجڑے وطن کا سہاگ ہے۔ تیرے ترے ہوئے لبوں پر بے ہند کا لہو ہے۔ آج تو نے ملک کو اپنی زندگی کی آخری قسط ادا کر دی اور اپنے خون سے دیکھ کر مے دی ہے۔ اے ننھی غنڈہ لڑکی

تیری موت آج ہم سب پر جاری ہے اور میں نہیں جانتا کہ کیا کروں کس طرف دیکھوں۔ کس کو بلاؤں۔ کس کو یاد کروں۔ کیوں کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے اور تیرے وطن کے بڑے آدمیوں نے تجھ سے خداوی کی ہے اور تیرا لواستقام کے لیے پکار رہا ہے۔

گجراتی لڑکی مرگئی۔ ایک دوسکیاں جے ہند کا دم ہوتا ہوا نغمہ، اور پھر اس کا خون پگھلے ہوئے باقوت کی طرح فرش پر پکھر گیا۔ مجھے فضا کی خاموشی یاد ہے۔ جیسے ساری کائنات رو رہی ہو۔ مجھے وہ نگاہ یاد ہے۔ جیسے ہزاروں برجیاں ایک ساتھ دل میں کبھی جا رہی ہوں۔ گجراتی لڑکی مر گئی اور اس کے ساتھ اس کا بچہ والا شوہر مر گیا اور اس کے خولصورت بچے مر گئے۔ اور زندگی اور اس کی تخلیق اور اس کی ساری کی ساری خوبصورتی مر گئی۔

کیا ہونا چاہیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ نغمہ اور وہ پکار اور وہ آہنگ جس میں اس بچی کا خون گھلا ہوا کبھی نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب کوئی گیت، کوئی چیخ، کوئی قہقہہ یا کسی کے خون سے سُج جائے تو پھر وہ کبھی نہیں مڑتا۔ وہ گلے میں پھندا بن

کے رہتا ہے۔ دل میں ناسور بن کے چھپتا ہے اور رُوح جیل کا شاہن کر کھٹکتا ہے اے غنڈہ کتنا آسان ہے، اے بھول جانا ممکن نہیں ہے۔

۳

تیسرا غنڈہ جو مجھے ملا وہ سکھ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں نہیں اپنی موت کے بعد مجھ سے ملا۔ اس نے ایک شلوار پہن رکھی تھی اور ایک پتلی دھاریدا قمیص اور اس کے چہرے پر گولی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ اس کا گندی چہرہ خاموش تھا خاموش اور غمزہ یاب اور اس کی چھوٹی بھری داڑھی میں ریشم کی ملائمت تھی اس کے خدو خال حسین تھے اور زمین کی طمانیت لیے ہوئے اس کے چہرے سے مجھے جاٹوں کے وہ گائوں یاد آ گئے جس میں دھرتی سونا اگلتی ہے۔ جہاں سونے کی موتیں اپنی سیاہ غزالی آنکھوں میں وحشی محبت کا خمیر لیے ہوئے ننگھٹ پر کھڑے ہو کر پڑیسوں کو پانی پلاتی ہیں۔ جہاں نہر کے کنارے لابی لابی دریا ٹی گھاس ہوتی ہے۔ اور نہر کے پے گیسوں کے خوشے سرسراتے ہیں اور خوشوں سے اُپر نیلا آسمان ہنستا ہوا آسمان اور اُپر اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک بھولا جہڑا خواب ایک پراسرار حقیقت، اچانک مسرت، یہ سب کچھ اس نوجوان سکھ کے چہرے

پر نظر آ رہا تھا۔ اس کی قمیص کی جیبیں ایک نامکمل خط تھا۔ یہ خط اس نے شاید صبح لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر وہ اسے مکمل نہ کر سکا کیونکہ صبح ہو گئی اور پھر اس کی زندگی کی شام آ گئی۔ اور اس کی آنکھوں کی بینائی اور اس کے ہونٹوں کی گویائی اور اس کے ہاتھوں کی طاقت اس سے چھن گئی۔ گندہ مر گیا۔ اس کا مجھے افسوس نہ تھا۔ افسوس اس خط کے نامکمل ہونے کا ہے یہ خط گورکھی میں تھا اس کا ترجمہ تو میں نہیں کر سکتا کوئی کسی کی روح کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس لمحے کا۔ اس زبان کا۔ اس طرزِ ادا کا۔ جو شخصیت ہے۔ پھر بھی جیسا بُرا بھلا مجھ سے ہو سکا۔ یہاں درج کرتا ہوں۔

”میری ماں جی۔ ست سری اکال۔ واہگور وکی کرپا سے میں یہاں خیریت سے ہوں اور خیریت آپ کی واہگور و مہاراج کی کرپا سے لکھنا مجھ کو بہت جلدی، اپنے کو ابھی کوئی ٹھکانا نہیں ملا ہے اور کوئی کام کاج بھی رہے نہیں۔ شہر بمبئی کے بیچ میں ڈنگا ہے اور ہندو مسلمان ایک ہے واہگور وکی کرپا سے فکر نہ کرنا۔ تیرا بیٹا جو روز کو ری صال کرے گا۔ تجھ کو دلپے بھیجے گا۔ اپنی اچھری بہن کی شادی کرے گا۔ اور اس باپ چوڑو کے بچے بننے کا سود بھی دے گا۔ میری ماں جی بدکلامی پر ہم کو ہاتھ کرنا۔

گلال چند ہفتے کا نام لیتے ہی تیرے بیٹے کو گتہ آجاتا ہے۔ ادھر ابھی میں کرپال سنگھ ڈرائیور کی لاری میں سوتا ہوں اور روز صبح اس کی لاری ڈھوتا ہوں۔ جگجیت سنگھ کو بولنا کہ وہ بہن بنتو کا بیاہ اس بھین یا دے منو ہر سنگھ سے نہ کرے نہیں تو اس کی جان مار دوں گا۔ جب مجھ کو نوکری ملتی ہے تو ایک دم اُس کے خود بنتو کو بھگا کے لے جاؤں گا۔ میری ماں جی وہ تمہاری بہو۔ اچھی بہو بن کے خدمت کرے گی۔ اور۔۔۔۔۔“

اس سے آگے خط کچھ نہیں کہتا۔ ہاں جو لوگ اس سکھ نوجوان کی لاش کو ہسپتال میں لائے تھے وہ کہتے تھے کہ اس نوجوان نے میری کیڈ پر اپنی جان دی ہے۔ وہ گرانٹ روڈ والے جلوس کے آگے آگے پگڑی منہا جٹا والا گیت گارہا تھا اور بے فکری سے آگے بڑھ رہا تھا اور جب اسے گولی لگی جب بھی گیت گارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانگرس اور لیگٹ نوں جماعتوں کے جھنڈے تھے۔ دائیں بائیں انھیں لہراتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور وہ اس خون کی بارش میں بڑھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ اور جب وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گر گیا تو اس نے کہا یہ میری قمیص اور شلوار کسی حاجت مند کو دے دینا اور مجھے

نیکھ دھرم اوسار جلا دینا۔ آنا کہہ کے اس نے جان مے دی۔ اور وہ
 دھبی ٹرام لائن پر گیا۔ اور دونوں جھنڈے اس کے خون سے سُرخ
 ہو گئے۔ لیگ کاسبز جھنڈا اور کانگریس کاسبز سفید زعفرانی جھنڈا دونوں
 اس کے خون سے ایسے سُرخ ہو گئے تھے کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ
 کون جھنڈا کس کا ہے اور وہ جو نہ ہندو تھا نہ مسلمان اس نے اپنا ہٹو
 دے کر دونوں جھنڈوں کو ایک کر دیا تھا۔ وہ جو ایک کسان تھا۔ لہجہ
 اور اُن پڑھ تھا۔ غنڈہ !

میں نے اس کی شلوار اور قمیض اپنے ہسپتال کے ہرجن دھوبی کو
 مے دی۔ دھوبی نے وہ شلوار پہن رکھی ہے۔ نیلی قمیض اس کی بیوی پہنتا
 جھا ہتی ہے۔ اس نے اسے پھر سیا ہے۔ جوڑا ہے۔ دوسرے کپڑے
 کے ٹکڑے لٹکائے ہیں اور اب یہ قمیض دھوبی کے گھر کے باہر جنگلے کی
 سلاخ پر پڑی جھول رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ عجیب قمیض ہے جو پنجاب آئی ہے
 جسے کسی کسان بچے کی ماں نے اپنے کانپتے تڑپتے ہاتھوں سے سیا ہے،
 شاعر اور لوگ بڑے بڑے لوگوں کو بڑے بڑے لیڈروں کو سلام کرتے
 ہیں۔ میں تجھے سلام کرتا ہوں۔ اے غریب مخلوک الحال قمیض بھولی ہوئی

تین غنڈے

بہتری ہوئی گایاں کھاتی ہوئی قمیص، میں تجھے ہزار بار سلام کہتا ہوں۔ تو نے اک بھولے جاٹ کے مضبوط سینے پر گولی کھائی ہے۔ تو نے اس سے پیار کیا ہے۔ اس کا ساتھ دیا ہے، زندگی میں اور موت میں اور اس وقت جب اس ملک کے بڑے بڑے چابنے والے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے تجھ پر ہزاروں سلام۔ اے میرے وطن کی وسیع غریبی کی طرح پیٹی پرانی قمیص، تو نے اپنی آغوش میں ایک معصوم کاشتکار کے دل کی دھڑکنیں چھپائی ہیں اور اب تو ایک ہرجمن ماں کے دودھ کی عزت اور اس کے ننھے بیٹے کی جان کی حفاظت کرے گی، انھیں بھی اپنی زندگی کی سادہ روئی بخش۔ انھیں بھی اپنی دھرتی کا پیار دے، اپنی روح کا وہ صادق جذبہ کہ جس سے ہم کنار ہو کے ہم سب بہتری کو چھپڑ کر کے لے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہو آئیں لہر آ رہ۔ ٹو حسن اور سچائی اور نیکی کی تصویر ہے۔ تو اس آنے والے طوفان کی تنویر ہے۔ جب زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور آدمی محبت کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح یہ تینوں غنڈے مر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ فساد کے دنوں میں ہوا۔ لیکن اب وہ ہنگامہ ختم ہو چکا ہے، اب چاروں طرف سکون ہے۔

امن اماں ہے۔ غنڈے مرچکے ہیں یا گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیے گئے ہیں اور اب شہر میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ہسپتال کے وارڈز خمیوں اور لاشوں سے پٹے پٹے ہیں، اب چین ہی چین ہے۔ اب کالی رات ہے خاموشی ہے۔ میں ہسپتال سے تھکا ماندہ آ رہا ہوں اور نہادھو کے کھانا کھا کے بستر کے قریب لیپ روشن کیے دیوان پر بیٹھا ہوں اور اخبار پڑھ رہا ہوں۔ اخبار میں لکھا ہے۔ مسٹر اور مسٹر بھنسی اور مسٹر بندی گر اور مسٹر ستوان اور دوسرے معزز شہری ایک انگریزی بحری جہاز پر مدعو کئے گئے ہیں جو ساحل پر اس لیے لنگر انداز ہوا ہے۔ تاکہ جہازی ہٹرائیوں کی بنیاد کا سدباب کر سکے۔ مسٹر بندی گر بات کے دولہا معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر بھنسی نے ایک ہلکے رنگ کی فلی میٹھیں پہنی تھیں جو بھنسی کی ساری کارنگ پگھلے ہوئے یا قوت کی طرح ہے۔ یہاں امن اور قانون اور ترقی اور دستور کا انقلاب کے جام پٹے جا رہے ہیں اور میں اخبار پھینک دیتا ہوں اور پھر ریک سے ایک کتاب نکال کے پڑھتا ہوں۔ انسان کی تاریخ از ایچ جی۔ ویلز اور میری آنکھوں کے سامنے بری کیڈنا چنے لگتے ہیں۔ آدمی نے ہزاروں سال پہلے بھی یہ بری کیڈنا بنائے تھے۔ ظلم اور جہالت اور گناہ کو مخلوب کمنے

تین خنڈے

کے لیے بیری کیڈ میری نگاہوں کے آگے نالچ رہے ہیں۔ بدھ، محمد، مسیح۔
... پھر روشنی کی مشعل کا نازا دیہ تبدیل ہو جاتا ہے چارلس اول کا سر نظر آتا ہے
دار پر لٹکتا ہوا۔ پیرس میں گلو تین... بکیون..... اکتوبر میڈرڈ.....
آج بھی بیری کیڈ کھڑے ہو رہے ہیں۔

مرا کو میں..... انجیریا میں..... مصر میں..... ہندوستان میں.....
انڈوچائنا میں..... انڈونیشیا میں..... یہ طوفان ہے طوفان، اسے
کون بٹھے گا۔... یہ انقلاب ہے انقلاب، اسے کون چھیڑے گا۔ یہ قمیص
ہے قمیص..... آدمی کی قمیص۔ ہوا میں لہراتی ہوئی۔ اسے گولیوں سے
چھلنی کر دو۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اسے بموں اور ٹینکوں سے
اڑا دو۔ یہ پھر ثابت ہو جائے گی یہ قمیص مرغیوں سے نہیں سکتی۔ یہ آدمی
کی روح ہے!